جسم فروشی کی تاریخ

جارج ریلے سکاٹ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

THE HISTORY OF PROSTITUTION



جسم فروشی کی تاریخ

مصنف: جارج ریلے سکاٹ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

نگارشات

نام کتاب: جسم فروشی کی تاریخ

مصنف: جارج ریلے سکاٹ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

ناشر: آصف جاوید

برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-37322892 FAX:37354205

مطبع: حاجی حنیف پرنٹر، لاہور

کمپوزنگ: عبدالستار 0333-4900629

سال اشاعت: 2013ء

قیمت: -/300 روپے

فہرست

☆☆☆

ابتدائیہ

جسم فروشی کا دھندہ کب شروع ہوا' اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں نے جو ریکارڈ پیش کیا ہے وہ بہت زیادہ متضاد کوائف رکھتا ہے بعض محقق اس پیشے کو قدیم عبادت گاہوں کے رسوم و رواج کے ساتھ جوڑتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی حد تک منطقی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں بعض ایسے قدیم مسودات بھی ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس نوعیت کی تحقیق کرنے والوں کا اصل مقصد کسی خاص مذہب یا قوم کے خلاف مواد اکٹھا کرنا تھا اور انہوں نے بہت سی جزئیات فرض کرلی ہیں جیسا کہ خالصتاً ہندوؤں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے والوں نے منظم اور باقاعدہ جسم فروشی کے دھندے کو دیوداسیوں کے ساتھ جوڑ دیا ہے' جواب میں اس دھندے کے بارے میں جو تحقیق ملتی ہے وہ اس کو دین دار مسلم حکمرانوں کے ساتھ نتھی کرنے کی ایک بھرپور کوشش معلوم ہوتی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خصوصاً برصغیر میں یہ پیشہ اس وقت منظم ہوا جب بیرونی حملہ آوروں کی یورشیں بڑھتی گئیں اور وہ بعض مقاصد کی خاطر ایک خاص مدت کے لیے کہیں رک جاتے۔ ان حملہ آوروں کے ہزاروں ساتھیوں کو وطن

سے دوری کے باعث خصوصی طور پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ان میں جنس مخالف کا نایاب ہونا بھی شامل تھا۔ حملہ آور جہاں پڑاؤ کرتے ان کے قرب و جوار میں عارضی طور پر ایسی لاوارث اور دھتکاری ہوئی عورتیں جمع ہو جاتیں جو محض پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ان کی جنسی آگ بجھانے پر رضامند ہوتیں۔ بچے کھچے کھانے کے عوض یہ فوجی ان عورتوں سے آسودگی حاصل کرتے۔ ایک حد تک اس روایت کو بھی باقاعدہ اور منظم جسم فروشی کا آغاز کہا جاسکتا ہے لیکن جسم فروشی کے دھندے نے آگے چل کر جو شکل اختیار کی وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم روایات اور قواعد وضوابط کی حامل تھی۔

جدید تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلا باقاعدہ چکلہ یا جسم فروشی کا اڈہ مسلمان بادشاہ محمد تغلق کے عہد میں قائم ہوا۔ محمد تغلق نے اپنے دارالحکومت دولت آباد کے مضافات میں ''طرب آباد'' کے نام سے یہ چکلہ قائم کیا۔ طرب آباد کے اولین باسیوں میں زیادہ تر سابقہ جنگوں کی وجہ سے ہونے والی بیوائیں اور نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم عورتیں تھیں۔ ان عورتوں میں زیادہ تر تامل نسل اور تیلگو نسل سے تعلق رکھنے والی غریب عورتیں شامل تھیں، جن کے سرپرست یا تو علاقائی یورشوں میں کام آئے یا پھر قابضین نے ان کو طویل المیعاد قید کی سزائیں دیں۔ طرب آباد اصل میں تغلق کے فوجیوں کی عشرت گاہ تھی، حملہ آور کا تعارف رکھنے والے فوجی ان عورتوں کے ساتھ زبردستی کا مظاہرہ کرتے اور اکثر عورتیں اپنے خواہشمند فوجیوں کی باہمی لڑائی میں ماری جاتیں۔ ان عورتوں کو اس طرح کی کشمکش میں اگر کوئی قتل کر دیتا تو اس فعل کو حکومت کوئی بڑا جرم تصور نہ کرتی اور قاتل کی حیثیت اور مقتولہ کے مقام کو مدنظر رکھ کر عموماً تھوڑے سے جرمانے کے عوض فیصلہ کر دیا جاتا اور جرمانے کی رقم ہمیشہ ریاست کو ملتی۔

دستیاب حقائق کی رو سے مورخ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حکیم سولن دنیا میں وہ پہلا شخص ہے جس نے خانہ بہ خانہ فحاشی کے سدباب کے لیے یونان میں سب سے پہلا چکلہ قائم کیا۔ حکیم سولن کا خیال تھا کہ اس کام کے لیے کوئی باقاعدہ جگہ مقرر

کردی جائے تو جسم فروشی کے عادی قبائل چل پھر کر یہ دھندہ نہیں کریں گے لیکن حکیم سولن کو اپنے اس مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی کیونکہ خانہ بدوش قبائل صرف جسم فروشی کی آمدنی پر اکتفا نہیں کرتے تھے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت بھی کرتے اور اپنے خاندانوں کو پالتے تھے۔ یہ خاندان ایک قلیل آمدنی کے حامل پیشے کے لیے ایک جگہ پابند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

اس وقت یونانیوں پر جنسی غلبے کا یہ عالم تھا کہ سب سے پہلے اظہار عقیدت کے لیے جن دو انسانوں کے مجسمے تراشے گئے ان میں ایک فاعل (ہرموڈیس) اور دوسرا مفعول (اسٹیوگیٹن) تھا۔ ہم جنسیت پر یقین رکھنے والوں کا یہ عالم تھا کہ اس وقت کے یونان میں اگر کسی لڑکے کو اس کا چاہنے والا نہ ملتا تو وہ اپنے تئیں اپنی زیادہ ندامت اور شرم محسوس کرتا کہ اکثر اوقات خودکشی کو ترجیح دیتا۔ عورت کی نسبت نوخیز لڑکوں کو جنسی اختلاط کے لیے ترجیح دی جاتی۔ کئی محققوں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں لڑکوں کے ساتھ شادی کا رواج ''ضبط تولید'' کی طرف پہلا قدم تھا خود سقراط نے اس فعل کو قابل تحسین قرار دیا حتیٰ کہ ارسطو نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ بیویاں ترک کر کے اسلز دبالمثل اختیار کریں۔ واضح رہے کہ توریت میں ہم جنس پرستی کے بڑے مرکزی شہر کا نام سدوم بیان کیا گیا ہے۔ انگریزی لفظ Sodomy اسی سے مشتق ہے۔ چارلس نیپیئر نے جب سندھ فتح کیا تو اس وقت کراچی میں زنانہ جسم فروشی کے اڈوں کے علاوہ تیس اڈے عصمت فروش لڑکوں کے تھے۔

برصغیر میں شاہی عمارتوں اور جسم فروش عورتوں کے کوٹھوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا ہے۔ تمام چکلے، رنڈی خانے ملک یا صوبے کے دارالحکومت کے اس حصے سے ملحق ہوتے جہاں قلعہ ہوتا یا امراء وزراء وغیرہ کے محل۔

مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس بطور خاص رنڈیوں کے لیے ایک وسیع علاقہ ''شیطان پورہ'' کے نام سے آباد کیا۔ اسی طرح دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلیٰ سے ملحق ''چاوڑی بازار'' تھا۔ اس علاقے میں درباری طوائفوں کا ایک ہجوم رہائش پذیر تھا۔ ان طوائفوں میں اکثریت ان کم سن

لڑکیوں کی تھی جو ایام طفولیت میں کسی بادشاہ یا شہزادے کی ''نظر کرم'' کا شکار ہوگئیں۔

محل سراؤں میں چونکہ پرانی اور خاندانی طوائفوں کے پہلے سے بھرمار ہوتی تھی لہٰذا ایسی نوخیز اور زبردستی بکارت سے محروم کی جانی والی لڑکیوں کے لیے یہی راستہ باقی رہ جاتا تھا کہ وہ جسم فروشی کے اڈوں پر بیٹھ جائیں اس سے پہلے کہ سماج کی بے رخی اور نفرت کے باعث اچانک عود کر آنے والی غربت اور عسرت سے ان کے جسم متعدی بیماریوں میں مبتلا ہوکر گل سڑ جائیں' یہ انہیں سجاتی اور بیچتی رہیں۔ چکلوں میں ایسی عورتوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی جو ڈھلتی ہوئی عمر کے باعث جسم فروشی کے قابل نہ تھیں اور نئی آنے والیوں کی سرپرستی کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ جیسے ہی کوئی لڑکی کسی افتاد کے باعث ان چکلوں کا رخ کرتی ان بوڑھی عورتوں میں اس کی سپردگی حاصل کرنے کے لیے کڑا مقابلہ ہوتا۔ جو کامیاب ٹھہرتی وہ بڑی آن بان کے ساتھ نوخیز دوشیزہ کو ناچ گانے کی تربیت دیتی اور گاہکوں کو پھانسنے سے لے کر اپنا گرویدہ بنا لینے تک کے تمام حربوں کی تربیت دیتی۔ اس عارضی ملکیت کے باعث جس کو عموماً مستقل سمجھا جاتا تھا (جب تک طوائف کو اس کا کوئی چاہنے والا بھگا کر نہ لے جاتا) لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کرنے والیوں کو نائیکہ کا نام دیا گیا۔

ہندوستان کی سماجی تاریخ پر تحقیق کرنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ قدیم زمانے میں رنڈیوں اور قیدی عورتوں کے ماتھے پر ٹیکا بنایا جاتا تھا۔ بعض محقق یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اس ٹیکے کی شکل عورت کی اندام نہانی سے متماثل بنائی جاتی جس کا مقصد ایک قسم کی تحقیر اور سماجی سطح پر شناخت تھا۔ لیکن قدیم ہندوستان کے بعض جنگلی قبائل میں بھی عورتوں کے ماتھے پر ٹیکا لگائے جانے کا سراغ ملا اور ان قبائل کے رسم و رواج کے مطابق اس ٹیکے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ٹیکے والی عورت شادی شدہ ہے۔ عموماً جنگلی قبائل یہ ٹیکا جانوروں کے خون کے ساتھ انگلی مس کر کے بناتے تھے۔ قدیم ہندوستان میں ''مشترک زوجگی نظام'' کے حامل ان قبائل میں ٹیکہ لگانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ کنواری اور غیر کنواری عورتوں میں فرق واضح کیا جائے۔

غرض اس ٹیکے کی وجہ کوئی بھی رہی ہو اس سے انکار نہیں کہ اس کی شکل عورت کی اندام نہانی سے مشابہ بنائی گئی۔ بعد میں یہ ٹیکہ ہندو عورتوں میں شادی کی شناخت اور سہاگن کے ساتھ ساتھ مذہبی طور پر نیک شگون کے طور پر بھی رواج پانے لگا۔ البتہ تمام مؤرخ اور محقق اس بات سے متفق ہیں کہ قیدی عورتوں کو خصوصاً ٹیکہ لگایا جاتا۔ اب بھی قیدی عورتوں کی صدیوں پرانی تصاویر اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کی یورشوں میں عموماً مفتوح قوموں اور قبائل کو اپنی عورتوں سے ہاتھ دھونا پڑتے اور حملہ آور ان قیدی عورتوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھتے۔ جب ان حملہ آوروں کو مال غنیمت اور مزید علاقوں کو فتح کرنے کی کشش اگلے قدم پر اکساتی تو مقبوضہ عورتوں کا کوئی پرسان حال نہ رہتا۔ فوجی دل بھر جانے کے بعد انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے اور پسماندہ علاقوں میں تباہی کے بعد نئے ابھرنے والے سماج میں ان عورتوں کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ بوڑھی عورتیں عبادت گاہوں اور درگاہوں پر آنے والوں کے رحم و کرم پر جسم اور پیٹ کا رشتہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتیں جبکہ جوان عورتیں یہ باور کر لینے کے بعد کہ اب سماج میں ان کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں جسم فروشی کے موجود طریقوں پر اپنی زندگی کو ڈھال لیتیں۔ یوں نیم مہذب انداز میں اور خالصتاً زندگی پوری کرنے کی موہوم سی خواہش کے تحت جسم فروشی کا یہ مجبورانہ انداز اپنی جگہ بناتا رہا۔ رفتہ رفتہ سماج ایسی عورتوں کو ان کی مطلوبہ ''جگہ'' فراہم کرنے کا عادی ہو گیا اور نچلے طبقات بھی ادھر رجوع کرنے لگے۔ اپنی تمام تر ضروریات اور رعنائیوں کے ساتھ یہ پیشہ مغل عہد میں اپنے آپ کو منظم کرتا ہوا ملتا ہے۔ زنانہ آواز اور جسم سے حظ اٹھانے کا بھرپور دور مغل بادشاہوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مغل جس علاقے کو اپنی راجدھانی بناتے وہاں پہلا کام چکلے کی آبادکاری ہوتا۔ عموماً شاہی قلعے سے ملحق آبادی کو اس طرح کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جاتا اور پیشہ ور عورتوں کو ان آبادیوں میں بسانے کے انتظامات کیے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بوقت ضرورت دستیابی میں کوئی سقم باقی نہ رہ جائے۔

قدیم تمدن پر تحقیق کرنے والے اس بات سے مکمل طور پر متفق ہیں کہ جسم

فروشی کا دھندہ مذہب کے زیرسایہ پروان چڑھا۔ ابتدا میں شادی شدہ عورتوں کی نسبت آزاد اور جسم فروش عورتوں کو زیادہ معزز اور محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ عبادت گاہوں میں ان عورتوں کی موجودگی بھی تھی جہاں یہ مقدس عبادت میں معاونت کا فریضہ سرانجام دیتیں۔ عبادت گزار جو دور دراز کا سفر کر کے مقدس عبادت گاہوں تک پہنچتے انہیں عبادت اور آرام کے لیے یہ عورتیں سہولت بہم پہنچاتیں اور عبادت گزاروں کی جنسی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتیں۔ جدید تمدن کی ابتدا کے ساتھ ہی مذہب اور زراعت کی شروعات نے عورت کے مرتبے کو بہت زیادہ بابرکت اور بلند قرار دے دیا۔ جوں جوں مذہب کی جزئیات کی تنظیم کا کام آگے بڑھتا رہا پیداوار کے ماخذ اجزاء کی عبادت کو زیادہ مقدس سمجھا جانے لگا۔ زمین کو دھرتی ماں کا درجہ دیا گیا اور اس کی پوجا ذوق شوق سے کی جانے لگی۔ آسمان اور سورج کو دیوتاؤں کا درجہ دیا گیا۔ آسمان سے بارش برستی جو فصلوں کو سیراب کرتی اور پیداوار کے عمل کو حتمی شکل دیتی۔ سورج فصلوں کو اپنی روشنی کے ذریعے زندگی دیتا اور یوں وہ بھی پیداوار کے اس عمل میں اپنا حصہ ڈالتا۔ اس زمانے کے سماج میں یہ عقیدہ زور پکڑ گیا کہ زمین کے پیداواری عمل اور جنسی ملاپ جیسے پیداواری عمل میں بہت زیادہ قریبی تعلق ہے اور اگر دونوں میں برکت کا عنصر مطلوب ہو تو ایک ہی وقت اور ایک ہی موسم میں دونوں فریضے ساتھ ساتھ سرانجام دیئے جائیں تو نہ صرف فصلیں شاندار ہوں گی بلکہ نسل انسانی بھی شاندار اور وافر ہوگی۔ ہل چلانا اور جنسی ملاپ ایک جیسا ثمر آور خیال کیا جاتا۔ یہ عقیدہ راسخ ہوگیا کہ دھرتی ماں کے معبد میں کثرت و تواتر سے جنسی ملاپ کیا جائے تو زمین کی بارآوری اور زرخیزی زور پکڑے گی اس عمل کو زمین پر خوشحالی اور موسموں کی خوبصورت کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا۔ مشابہت کے نقطہ نظر کے تحت عبادات اور کرامات روا رکھی جانے لگیں۔ اگر بارش مقصود ہوتی تو زمین پر خوب پانی انڈیلا جاتا۔ دھرتی کے معبدوں میں منتخب حسین لڑکیاں رکھی جاتیں جن کے ساتھ پجاری اور یاتری جنسی ملاپ کرتے۔ ان معبدوں میں اس مقدس عمل کے لیے اکثر و بیشتر روساء اور شرفاء اپنی لڑکیاں یہاں چھوڑ جاتے اور اس عمل کو نیک

ترین عمل قرار دیا جاتا۔

مذہبی تہوار عموماً فصلوں کی بوائی یا برداشت یا غلہ اٹھانے کے موسم کی مناسبت سے رکھے جاتے تھے ان تہواروں کے موقع پر خصوصی طور پر معبدوں کی زینت بننے والی مقدس دیوداسیوں کو مدعو کیا جاتا اور ان کو شرفاء اور امراء کی صفوں میں جگہ دی جاتی۔ تمام قدیم تہذیبوں میں مذہب سے وابستہ ایسی رسوم ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کو پیداوار' بڑھوتری' امن' خوشی اور شادمانی کے استعارے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اسی طرح عشق و محبت کی دیویاں بھی زمین کے ساتھ بہت سی خصوصیات مشترک رکھتی تھیں۔ تہوار جو عام طور پر فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے موقع پر منائے جاتے ان میں دیوداسیوں کے معبدوں میں جنسی ملاپ کو مقدس خیال کیا جاتا۔

غرضیکہ مذاہب قدیم میں عورت کو بارآوری اور بڑھوتری کے ساتھ منسوب کر کے اس کے جسم سے لطف اندوز ہونے کی اجتماعی مثالیں عام مل جاتی ہیں۔ ہیرو ڈوٹس ایک جگہ لکھتا ہے: ''بابلیوں کی ایک رسم بڑی شرمناک ہے۔ ہر جوان عورت کو اپنی عمر میں ایک مرتبہ زہرہ (عشتار) کے مندر میں جا کر کسی نہ کسی یاتری سے مقاربت کرنا پڑتی ہے امراء کی عورتیں لونڈیوں کے جھرمٹ میں گاڑیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں جن پر پردے چھٹے ہوتے ہیں اور مندر میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں مندر میں اپنے سروں پر پھولوں کے ہار لپیٹ کر بیٹھتی ہیں۔ ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اور آئندہ روز کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کے درمیان رسیاں کھینچ کر نشاندہی کر دی جاتی ہے اور یاتری وہاں جا کر اپنے پسند کی عورت چن لیتے ہیں۔ جو عورت ایک بار مندر میں آ جائے وہ واپس نہیں جا سکتی۔ جب تک کوئی اجنبی اس کی طرف چاندی کا سکہ نہ پھینکے اور اس کے ساتھ خلوت میں نہ جائے۔ جب وہ سکہ پھینکتا ہے تو کہتا ہے: ''دیوی تجھے برکت دے۔'' چاندی کا سکہ خواہ کتنی ہی مالیت کا ہو عورت کو قبول کرنا پڑتا ہے کہ اس سے انکار کرنا خلاف قانون ہے جب یہ سکہ پھینک دیا جاتا تو مقدس بن جاتا ہے۔ پہلا آدمی جو سکہ پھینکتا ہے عورت کے ساتھ خلوت

میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی قیمت پر بھی اس کے ساتھ معاشقہ نہیں کیا جاسکتا۔ کشیدہ قامت خوبرو عورتیں جلد فارغ ہوجاتی ہیں جبکہ بدصورت عورتوں کو خاصی مدت تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

پوری قدیم تاریخ اس طرح کے واقعات سے اٹی پڑی ہے جن میں مذہب کی رسم کے نام پر عورتوں کا جنسی طور پر استعمال کیا جاتا۔ قدیم یونان میں افروڈایتی کے معبدوں میں مقدس کسبیاں پجاریوں اور یاتروں کی جنسی پیاس بجھاتی رہتیں۔ قدیم ہندوستان کی عبادت گاہوں میں سینکڑوں دیوداسیاں قیام پذیر رہتیں جنہیں گانے بجانے اور ناچنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پنڈت اور پجاری ان دیوداسیوں سے جنسی ملاپ کرتے۔ سومناتھ کے مندر میں پانچ سو سے زائد دیوداسیاں موجود تھیں جو صبح و شام رقص کی محفلیں سجاتیں۔ اس مندر کے لیے بڑے بڑے امراء اور راجے مہاراجے اپنی بیٹیاں بھینٹ دیتے تھے۔ ایک انگریز صحافی بیورلے نکلسن جو آج سے تقریباً 100 سال پہلے ہندوستان کی سیاحت کے لیے آیا اس نے یہاں کے رسم و رواج سے متاثر ہوکر طویل عرصے تک یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں قیام کے دوران اپنے مشاہدات و تجربات کو ''ورڈکٹ آن انڈیا'' کے نام سے لکھا۔ بیورلے نکلسن کی اس تصنیف کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ بیورلے نکلسن ''ورڈکٹ آن انڈیا'' میں لکھتے ہیں: ''جنوبی ہند میں سری رنگم اور رچناپلی کے مندروں میں آج بھی دیوداسیاں موجود ہیں اور آج بھی ان دیوداسیوں کے فرائض وہی ہیں جو آج سے پانچ سو سال پہلے تھے۔ یہ دیوداسیاں پنڈتوں اور پجاریوں کے رحم و کرم پر زندہ رہتی ہیں۔ ان میں لاتعداد ایسی بھی ہیں جن کے خاندان آج بھی ہندوستان پر حکومت کررہے ہیں لیکن مندروں میں بچیوں کے چڑھاوے چڑھانے کی رسم کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہوسکا۔''

ہندوستان کے معروف محقق جناب ڈی ڈی کوسمبی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہب اور ثقافت میں لاتعداد ایسی چیزیں شامل کردی گئی ہیں جن کا کسی مقدس روایت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ملتا لیکن ان چیزوں کو بعض پنڈتوں اور مہاراجوں نے

اپنی خواہش کی بنا پر مذہب میں شامل کر دیا۔ تصیح کا عمل چونکہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے نئی چیزوں کو بھی عموماً قبول کر لیا جاتا اور ان کا درجہ دیگر عبادات جیسا قرار پاتا۔ دیوداسیاں اور ان کے جنسی فرائض کے بارے میں بھی یہی ابہام پایا جاتا ہے کہ ان کو مندروں میں پہلی بار کون لے کر آیا لیکن صورت یہ بن گئی ہے کہ اب ان کو مندروں سے نکالنا مشکل ہے اگر ان کو مندروں سے زبردستی یا کسی اصلاح کے پیش نظر نکالنے کی کوشش کی گئی تو پھر ان کا عام آبادی میں شامل ہو کر رہنا ناممکن ہوگا اور یہ اپنے پیشے کو جو کبھی مقدس تھا روزی روٹی کا وسیلہ بنائیں گی اور ان کی نسلوں میں یہ جذبہ موجود رہے گا کہ جسم فروشی ایک مقدس روایت سے منسلک ہے اور یہ کسی قسم کا گناہ یا برائی نہیں بلکہ اس طرح رزق کمانا حلال اور قدرتی ہے۔

حقیقت میں یہی ہوا ہے جب اصلاح پسندوں نے جدید دنیا کے رجحانات سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں اپنے اپنے مذاہب کی تطہیر کا کام شروع کیا تو نہایت خاموشی کے ساتھ انہوں نے ایسی تمام رسوم کو مذہب سے کاٹ پھینکا جن کے باعث جدید دنیا ان کے مذاہب کو تنقید کا نشانہ بناتی۔ یہی نہیں بلکہ بعض ایسے مذاہب نے بھی اپنے اندر موجود اور مختلف حیلے بہانوں سے جائز قرار دی گئی جسم فروشی کو ترک کر دیا اور اس کا حوالہ ماضی کی مبہم تاریخ سے لیا گیا کہ فلاں مقدس شخصیت اس فعل کو ناجائز قرار دے کر اس کی بندش کا اعلان فرما چکی تھی لیکن بدقسمتی سے اس فعل کو ختم نہ کیا جا سکا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس سے جان چھڑائی جائے اور مذہب کو حقیقی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس طرح کی اصلاح پسندی کا پہلا نشانہ بے سہارا اور مجبور عورتیں بنیں۔ ان کو تحفظ دینے کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور انہیں موقعہ دیا گیا کہ وہ اپنا پیشہ جاری ضرور رکھ سکتی ہیں لیکن ان کو مذاہب اور عبادت گاہوں کی آڑ لینے سے روک دیا گیا۔ ان عورتوں نے عام زندگی میں اپنے پیشے کے ساتھ قدم رکھا اور شروع کی کچھ مشکلات کے بعد آزاد معاشروں میں اپنی ضرورت اور اہمیت کو منوا لیا۔ وہی مذہب جو کبھی ان کا سرپرست تھا اور جس کی وجہ سے یہ بے گناہ اور معصوم عورتیں اس پیشے کی طرف زبردستی لائی گئیں، اب ان کا کھلا دشمن بن گیا۔ مذہب کی براہ راست

تنقید کے باعث بعض اوقات ان کو بھاری نقصان کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن مذہب اپنی تمام تر شدت کے باوجود اس پیشے کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور نہ ہی ایسا ممکن نظر آتا ہے اگرچہ سماجی تطہیر کے نام پر ان کو زبردستی ختم کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن دوسری طرف ان کی مانگ اورضرورت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا اور ان کو باقی رکھنے کی خواہشمند قوموں نے مذہب کی کوششوں کو ابھی تک کامیاب نہیں ہونے دیا۔

جیسے ہی عیسائیت کی آمد کے ساتھ مندروں کو تباہ کرکے مذہب کی سرپرستی میں چلنے والی جسم فروشی کو بند کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کام نے باقاعدہ کاروباری صورت اختیار کرلی اور دوسری اجناس کی طرح جنس بھی سربازار فروخت ہونے لگی۔

برٹرنڈرسل ایک جگہ لکھتے ہیں:

''عیسائیت کی اشاعت سے پہلے فحبگی مندروں تک محدود تھی جہاں اسے ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ عیسائی برسراقتدار آگئے تو انہوں نے مندروں کو منہدم کرا دیا اور اس ادارے کا خاتمہ کردیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت فروشی معاشرے میں ہر کہیں نفوذ کرگئی اور اسے خرید وفروخت کی جنس بنا لیا گیا۔ جس سے قحبہ خانوں کے مالک بے انتہا نفع کمانے لگے۔ ان منظم قحبہ خانوں میں کسبی کی حیثیت محض ایک محنت کش کی تھی، نفع مالکوں کی جیب میں جاتا تھا۔ ہمارے زمانے کی آزاد کسبی کا وجود بعد میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان میں ابھی تک مذہبی عصمت فروشی کا ادارہ پوری طرح ختم نہیں ہوا۔''

جیسا کہ شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ حکیم سولن نے پہلا منظم چکلہ کھولا تھا۔ جب حکمران طبقوں نے دیکھا کہ عصمت فروشی ایک منافع بخش کاروبار ہے تو اسے پوری طرح منظم کرکے آمدنی کا وسیلہ بنالیا گیا۔

شروع میں یونان کے مختلف شہروں میں باقاعدہ جسم فروشی کے اڈے کھولے گئے اور ان اڈوں میں ماضی کی مذہبی عصمت فروش عورتوں کو رکھا گیا۔ جسم فروشی کے اڈے کا مالک عموماً علاقے کا حاکم یا اس کا قبیلہ ہوتا تھا۔ لوگوں کی بڑی

تعداد ان اڈوں کی طرف رجوع کرتی اور حاصل ہونے والی آمدنی مالک کی جیب میں چلی جاتی۔ پیشہ ور عورتیں نامناسب سہولیات اور خوراک کی عدم دستیابی کے باعث بہت جلد بیمار پڑ جاتیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ جسم فروش عورتوں کی اکثریت تیس سے چالیس سال کی عمر میں موت سے ہمکنار ہوجاتی اور ان کی جگہ ان عورتوں کی اولاد لے لیتی۔ شروع کے ایام میں ان عورتوں کو حمل سے بچانے کا کوئی مؤثر طریقہ موجود نہ تھا جس کے باعث یہ عورتیں دھڑا دھڑا اولاد پیدا کرتیں اور وقت سے پہلے مر جاتیں۔ بعض روایات کے مطابق جسم فروشی کے اکثر اڈوں پر نابالغ لڑکیوں سے بھی پیشہ کرایا جاتا جن کی اکثریت اولاد کی پیدائش کے وقت کم عمری اور طبی سہولیات کی عدم موجودگی کے باعث ہلاک ہوجاتی۔

حکیم سولن نے ایتھنز کے سرکاری قحبہ خانہ کو منظم کر کے اس کے قواعد مرتب کیے۔ حکیم سولن نے پیشہ ور عورتوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ان کا خرچ مقرر کیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ پیشہ ور عورتوں کو ان کی عمر، نسل اور خوبصورتی کی بنا پر آمدنی میں حصہ دیا جانے لگا۔ اس سے پہلے عموماً یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص پیشہ ور عورتوں سے مستفید ہونے کے لیے جسم فروشی کے اڈے پر آتا تو اس سے داخل ہونے کے راستے پر ہی معاوضہ حاصل کرلیا جاتا لیکن اب یہ ہونے لگا تھا کہ وہ جس طبقے کی عورت کو پسند کرتا اڈے کا مالک اس تناسب سے رقم وصول کرتا اور پسند کی گئی عورت کو بھی اسی وقت ایک مناسب حصہ ادا کرتا۔

یونان کے جسم فروشی کے اڈوں پر سب سے اعلیٰ درجے کی عورتوں کو عام لوگوں سے پردہ کرایا جاتا اور اڈے کا مالک ان عورتوں کی رہائش اور کھانے کے لیے علیحدہ بندوبست کرتا اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ان عورتوں کے لیے کیا گیا انتظام و انصرام اڈے کے مالک کی اپنی عورتوں کو بھی نصیب نہ ہوتا۔ قدیم یونان میں بعض ایسے جسم فروشی کے اڈے بھی ملتے ہیں جہاں جسم فروش عورتوں کی طبی ضروریات کے لیے حکماء بھی بھرتی کیے گئے۔ اس زمانے میں یا تو دربار کے ساتھ حکماء منسلک ہوتے تھے یا پھر قحبہ خانوں کے ساتھ ان کا معاہدہ چلتا تھا لیکن اسی زمانے میں یونان

میں ایسی عورتوں کی بھی بھرمار تھی جو آزادانہ جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھیں۔ ان عورتوں کا تعلق عموماً چھوٹے طبقات سے ہوتا جن کو یونانی اشرافیہ ذلیل سمجھتی۔ یہ عورتیں بازاروں میں چل پھر کر اپنا گاہک تلاش کرتیں اور اپنے اپنے خاندانوں کا پیٹ بھرتیں۔

اسی زمانے میں ایسی پیشہ ور عورتیں بھی تھیں جو بندرگاہوں پر اپنا جسم فروخت کرتیں۔ یونان میں انہیں ''پورنائی'' کا نام دیا گیا۔ ان عورتوں کی سماجی سطح پر بہت تذلیل کی جاتی۔ ان کا محلہ عام آبادی سے دور ہٹ کر ہوتا اور یہ عورتیں اپنے دروازوں پر دیوتا پرائے پس کے عضوتناسل سے مشابہ ایک نشان لٹکاتیں۔ یہ عورتیں گاہک کے انتظار میں اپنے دروازوں پر نیم برہنہ ہوکر بیٹھتیں۔ اس لیے ان عورتوں کو جمنائی بھی کہا جاتا جس کے لغوی معنی ''ننگا'' کے ہیں۔ یہ عورتیں اپنے گاہکوں کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کرتیں۔ معاہدے کی مدت ایک دن' ایک ہفتہ' ایک ماہ یا ایک سال بھی ہوسکتی تھی۔ لوگ ان عورتوں کو معاہدے کے بعد اپنے ساتھ اپنی آبادیوں میں لے جاتے اور معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی ان کو آزاد کردیتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ایک عورت کو دو تین مرد بھی معاہدہ کرکے لے جاتے اور اپنی تعداد کے مطابق اس عورت کے خاندان کو معاوضہ دیتے۔ اس معاہدے کی دلچسپ شق یہ ہوتی تھی کہ معاہدے کی مدت کے دوران عورت کو حاملہ نہیں کیا جائے گا اور اگر عورت حاملہ ہوگئی اور اس کی تصدیق کسی طبیب یا حکیم نے کردی تو پھر اسی وقت یہ معاہدے ختم تصور کیا جائے گا اور اس عورت سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کی کفالت وہ مرد کرے گا جس سے نے عورت کو حاملہ کیا تھا۔ بالکل اس روایت سے ملتا جلتا ایک معاہدہ بہت بعد میں آنے والے مذاہب میں بھی ملتا ہے جہاں مسافر مرد پیشہ ور عورتوں کے ساتھ معاہدہ کرتے اور بدلے میں ان کو نقدی یا اجناس وغیرہ دیتے۔ یہ معاہدہ عموماً عورت اور مرد کے مابین ہوتا اور اگر معاہدے کی مدت زیادہ طویل ہوتی تو اس موقع پر ایک یا دو گواہ بھی مقرر کیے جاتے جو معاہدے کی تفصیلات کو احاطہ تحریر میں لے آتے۔ اس معاہدے کے بعد مرد عموماً عورت کے گھر پر ٹھہرتا' بعض اوقات

وہ عورت کو اپنے گھر بھی لے جاتا لیکن زیادہ تر عورت ہی میزبان ہوتی۔ معاہدے میں اس شق کو لازمی طور پر لکھا جاتا کہ اگر معاہدے کے دوران عورت حاملہ ہوگئی تو پیدا ہونے والا بچہ مرد کی جائیداد کا وارث ہوگا اگرچہ بعد میں اس رسم کو ختم کر دیا گیا لیکن نجی سطح پر یہ رسم آج بھی پوری طرح زندہ ہے لیکن آج کوئی بھی ریاست اس رسم کو جاری کرنے کی اجازت نہیں دیتی جبکہ چوری چھپے لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔

قدیم یونان میں پورنائی کسبیاں اپنے گھروں کی دیواروں پر فحش تصاویر بنواتیں قدیم کھنڈرات کی کھدائی کے بعد اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ پورنائی عورتوں کے علاوہ طوائفوں کا طبقہ آل ٹرائڈ بھی تھا۔ یہ طبقہ سماجی طور پر پورنائی طوائفوں سے بہتر تھا اور اس کو ان سے زیادہ بلند تصور کیا جاتا اور عزت دی جاتی۔ اس طبقہ کی طوائفیں ناچ گانے کے ساتھ گاہکوں کا دل لبھاتیں اور ناچ گانا ختم کرنے کے بعد مہمان کے ساتھ خلوت میں چلی جاتیں۔ ان طوائفوں کے بازار پورنائی طوائفوں سے بہتر اور صاف ستھرے ہوتے۔ ان بازاروں سے ملحق حکیم اپنا مطب بناتے جہاں بیمار طوائفوں اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کا علاج ہوتا۔ ان طوائفوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے الگ سکول کھول رکھے تھے جہاں ان کے بچوں کو عام تعلیم کے علاوہ ناچ گانے اور گاہکوں کا دل لبھانے کے لیے گر سکھائے جاتے تھے۔ آل ٹرائڈ طبقے کی طوائفیں زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کی خواہش کرتیں اور اگر ان کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوجاتا تو جان بوجھ کر اس کی صحت اور خوراک کا بہتر خیال نہ رکھا جاتا جس کے باعث لڑکے اکثر ہلاک ہوجاتے یا پھر اگر زندہ بچ جاتے تو نہایت لاغر اور سست ہوتے۔ اس طبقے کی طوائفیں جب بوڑھی ہوجاتی تو ان کے معاشرے میں ان کی ضرورت اور بڑھ جاتی۔ بوڑھی طوائفوں کو ایک طرح سے سردار کا رتبہ دیا جاتا اور اس کے مشوروں اور ہدایت کو اولیت دی جاتی۔

معروف مؤرخ علی عباس جلالپوری اپنی کتاب ''جنسیاتی مطالعے'' میں لکھتے کہ آل ٹرائڈ طبقے سے بھی بالاتر طبقہ ہٹیرا نام کا تھا جس کے معانی ''خاتون دوست''

کے ہیں جو عام طور پر شہری ہوتی تھیں اور اپنے گھروں میں دھندہ کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ کوچہ گرد کسبیاں بھی تھیں جو چل پھر کر دھندہ کرتی تھیں۔ یہ کوچہ گرد طوائفیں اپنے جوتوں کے تلوؤں پر یہ عبارت کھدوا لیتی تھیں: ''میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔'' جب یہ عورتیں راستہ چلتیں تو یہ الفاظ کے ان کے پیچھے کندہ ہوتے جاتے اور تماش بین ان کے پیچھے چلے جاتے۔ طوائفوں کے اس طبقے نے یونانی معاشرے میں سب سے زیادہ ترقی کی اور ان کی نسل دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ پورے یونان میں ان طوائفوں کا غلبہ ہوگیا اور انہوں نے اپنے دھندے کو جدید خطوط پر استوار کرلیا۔ پہلے پہل یہ اکیلی بازاروں اور گلیوں میں چل پھر کر دھندہ کرتیں تھیں، بعد میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے قافلوں کی شکل میں جسم فروشی کا دھندہ شروع کیا۔ طوائفوں کے قافلے شہر شہر قریہ قریہ گھومتے اور تماش بینوں کو ان کے گھروں میں تفریح بہم پہنچاتے۔ اس زمانے میں رواج یہ تھا کہ کوچہ گرد طوائفوں کا قافلہ اپنے ساتھ ایک بگل بجانے والے کو بھی رکھتا جو قافلے سے دو تین میل آگے چلتا اور لوگوں کو قافلے کی آمد کی اطلاع دیتا جاتا۔ لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ طوائفوں کا قافلہ ان کی بستی میں آنے والا ہے لوگ اکٹھے ہوکر اس قافلے کا استقبال کرتے اور اپنی اپنی پسند کی طوائف کو چن لیتے۔ یہ طوائفیں اپنی اور اپنے مال اسباب کی حفاظت کے لیے باقاعدہ گھڑسوار محافظ بھی ساتھ رکھتیں اور ان کو پرکشش معاوضہ دیتیں۔

قدیم یونان میں عورتیں عموماً پردے میں رہتیں اور مردوں کی مجالس میں شرکت نہ کرتیں ان عورتوں کا کام گھر کے معاملات سنبھالنا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ تعلیم سے بھی محروم رہ جاتیں۔ ان عورتوں کے برعکس ہیٹرا تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور علوم و فنون میں دسترس رکھتی تھیں۔ یہ عورتیں علمی مباحثوں میں حصہ لیتی اور اپنے استدلال سے بعض اوقات بڑے بڑے فلاسفروں کو لاجواب کردیتیں۔ اسی طرح کی ایک ہیٹرا کو مشہور فلسفی سقراط اپنی استاد مانتا تھا۔

اگر ساری دنیا کی تہذیبوں میں طوائفوں کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اکثریت عام لوگوں سے زیادہ حسین اور ذہین ہوتی تھیں۔ یہ

عورتیں علم وفن میں خاص مہارت حاصل کرتیں اور بڑے بڑے اساتذہ ان سے فیض حاصل کرتے۔ یونان میں بعض ایسی طوائفیں بھی ملتی ہیں جن کے علم و فضل کے چرچے عام تھے اور وہ عام مناظروں میں بڑے بڑے علماء کو مات دیتی تھیں۔

قدیم یونان میں سقراط کی استاد کے علاوہ ایک طوائف آر کے نیسا کو افلاطون کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے اور یہ مشہور ہے کہ افلاطون آر کے نیسا کے علم وفضل سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے بھی حظ اٹھاتا تھا۔ اسی طرح ابیقورس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ دنائی نام کی ایک طوائف پر فریفتہ تھا اور دنائی بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اسی طرح سوفوکلیز تھیورس نامی طوائف سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یونان میں انہی دنوں ایک اور طوائف اسپاشا کا طوطی بولتا تھا جو فلسفہ و ادب میں کمال بصیرت رکھتی تھی اور پریکلز جیسا عالم فاضل شخص اس عورت کا عاشق تھا اور ان دونوں کے عشق کے چرچے عام تھے۔ ہیڑا طوائفوں میں تھمسٹونو سب سے مشہور طوائف ہے۔ اس طوائف کے سینکڑوں چاہنے والے تھے۔ یونان ہی میں نتھینیا نامی طوائف کا بہت چرچہ تھا۔ اس کی بیٹی بھی بہت خوبصورت تھی اور یہ طوائف اپنی بیٹی کے ساتھ شب بسری کرنے والے سے ایک ہزار درہم وصول کرتی تھی۔ اسی طرح درجنوں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ طوائفوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی یہ شہرت ان کی جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان کے فلسفہ و ادب میں کمال رکھنے کی وجہ سے بھی تھی۔

قدیم عرب سماج میں باقاعدہ منظم طریقے سے جسم فروشی کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ ہاں البتہ دیگر عام سماجوں کی طرح عام رہن سہن میں لوگوں کے آپسی جنسی تعلقات کا رجحان ملتا ہے جو بکھرے ہوئے سماج، گرم مرطوب آب و ہوا اور خوراک کے جنس افزاء ہونے کا بڑا سبب ہے۔ ان تعلقات کے افشاء کے بعد عموماً قدیم عرب طویل ترین جنگیں لڑتے اور نسلیں تباہ و برباد ہوتی رہتیں۔ عموماً لڑکی کا خاندان جنسی تعلقات کے افشاء کو اپنی شدید توہین اور بے عزتی تصور کرتا اور لڑکے پر حملہ کر کے اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض عرب قبائل لڑکی اور لڑکے کو زندہ گرفتار

کر کے تمام لوگوں کی عبرت کے لیے دونوں کو اکٹھے قتل کر دیتے اور ان کے اجسام کو چوراہوں میں لٹکا دیا جاتا تا کہ آبادی اس برے فعل سے عبرت حاصل کرے۔

جیسے جیسے عرب سماج ترقی کرتا گیا اس کی روایتی سختی میں کمی واقع ہوتی گئی۔ ایک ایسا سماج جہاں عورت اور مرد کے خفیہ تعلقات کا افشاء بھرپور خانہ جنگی شروع کرا سکتا تھا وہاں اب اس بات کا ادراک کیا جانے لگا کہ مخصوص حالات میں ایک اجنبی مرد کو ایک عورت کے وجود کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ شروع میں کمتر حیثیت کے مالک قبائل کی عورتوں نے معاوضہ کے عوض کسی اجنبی مرد کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی روایت کا آغاز کیا۔ یہ عورتیں عموماً جنگلوں سے باہر نکلنے والے راستوں' شہروں میں داخل ہونے والے راستوں یا طویل صحرائی راستوں کے وسط میں ڈیرہ ڈال لیتی اور مسافر سکوں یا اجناس وغیرہ کے عوض ان کے ساتھ شب بسری کرتے۔ رفتہ رفتہ پورے عرب سماج نے اس روایت کو قبول کر لیا اور اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ یہ فعل کرنے والی عورت کا نام اور خاندان پوشیدہ رکھا جائے۔ مسافروں کی بڑی تعداد یہ معاہدہ کرتی اور پیشہ ور عورتوں کو معاہدے کے مطابق معاوضہ ادا کیا جاتا۔ بعد میں اگرچہ اس رسم کو ایک طرح کی قانونی حیثیت دے دی گئی لیکن بعض دھڑوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی رہی کیونکہ وراثت کے معاملات کو سلجھانے کے لیے کوئی واضح طریقہ کار موجود نہ تھا۔ لوگوں کی اکثریت طویل مدت کے لیے جنسی تعلقات قائم کرنے کا معاہدہ کرتی اور معاہدہ تحریری نہ ہونے اور گواہوں کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاہدے کی جزئیات سے روگردانی کرنے لگی۔ اس روگردانی کا نقصان ہمیشہ عورت کو ہوتا اور مرد حضرات اس کو حمل کی حالت میں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ حاملہ عورت بچے کی پیدائش سے بچنے کی کوشش کرتی اور اس کوشش میں اکثر اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے یا قبیلے سے قطع تعلق کرنا پڑتا اور حاملہ ہونے کی وجہ سے اس کو کوئی مرد پسند بھی نہ کرتا اس لیے اس کو فاقوں کا سامنا بھی اٹھانا پڑتا۔ اس لیے اس روایت کی مقبولیت میں کمی آنے لگی اور سماج کے مختلف دھڑوں کی مخالفت کے باعث عربوں نے اس رسم کو

ختم کرنے کا اعلان کردیا اور اس فعل کے مرتکب ہونے والوں کو کڑی سزائیں دینے کا بھی اعلان کیا۔

عرب میں اس رسم کے خاتمے کے بعد یہ قریبی ریاستوں میں عام ہونے لگی لیکن اس کے قواعد وضوابط کو کسی بھی ریاست نے قانونی حیثیت دینے کی کوشش نہ کی۔ خلیجی ریاستوں کے علاوہ کئی دوسرے مسلم ممالک میں یہ روایت آج بھی چوری چھپے جاری ہے لیکن اس کی سختی سے حامی ریاستوں نے بھی اس کے قابل عمل ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے اس پر پابندی عائد کردی ہے۔ جبکہ لاتعداد لوگ آج بھی نجی طور پر اس کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور باقاعدہ پیشہ ورعورتوں کی ایک تعداد اس رسم کو اسلامی رسم قرار دیتے ہوئے اس کا سہارا لیتی اور اپنا کاروبار آگے بڑھاتی ہے۔

ساری دنیا کی قدیم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جسم فروشی ہر جگہ تواتر کے ساتھ رائج رہی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ہر علاقے کے لوگوں کے مزاج اور حالات کے باعث اس کی مختلف شکلیں بنتی اور مٹتی رہی ہیں۔ کہیں پر اس کو ریاستوں نے قانونی شکل دی، کہیں قانونی شکل دیئے بغیر اس کو ایک سماجی رسم کے طور پر پھلنے پھولنے دیا گیا اور کہیں کسی خاص مذہب یا وہم کے زیر اثر اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ تمام قدیم تہذیبوں میں اس روایت نے ارتقاء کی مختلف منازل طے کی ہیں اور جیسے جیسے زمانہ اور سماج جدید ہوتا گیا اس پیشے میں بھی جدت کا عنصر آتا گیا۔ یا یوں کہیے کہ اس پیشے نے بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے۔

اہل یونان کے ہاں پیشہ ور جسم فروش عورتوں سے تعلق رکھنا ایک تہذیبی اور ثقافتی مشغلہ قرار دیا جاتا رہا۔ یونان کے لوگ کسبیوں اور جسم فروش عورتوں کو پیار سے بلبل، ابابیل، جگنو، گڑیا، شیرنی، چڑیا، مشعل اور اس جیسے نام دیتے تھے۔ یونان میں نوجوان تربیت کے لیے یا تو فلاسفر کے پاس جاتے تھے یا پھر کسبیوں کے پاس بیٹھتے تھے۔ یہ پیشہ ورعورتیں بھی فلسفیوں کو اپنا حریف سمجھتی تھیں اور انہیں برا بھلا کہا کرتی تھیں۔ روایت کے مطابق یونان کا ایک جرنیل تھمسٹو کلیز جب بازار سے گزرتا تو اس کے رتھ کے آگے گھوڑوں کی بجائے کسبیاں ہوتیں۔ یہ بھی روایت بہت مستند قرار دی

جاتی ہے کہ سکندر اعظم نے اپنی منظورِ نظر پیشہ ور عورت ''تائیس'' کے اکسانے پر ایرانیوں کا عظیم الشان شہر ''اصطخر'' آگ لگا کر راکھ کر دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف شہنشاہوں اور حکمرانوں کے بارے میں ایسی ایسی ناقابل یقین داستانیں ملتی ہیں جن کی وجہ ان کی منظورِ نظر جسم فروش عورتیں تھیں، جن کے کہنے پر یا جن کی وجہ سے حکمرانوں اور بادشاہوں نے ہزاروں کو تہہ تیغ کر دیا۔

مختلف ادوار میں اور مختلف تہذیبوں میں جسم فروش عورتوں، ان کے دھندے اور ان کی آبادیوں کے مختلف نام رہے ہیں۔ مثال کے طور پر روم میں جسم فروشی کے اڈے کو ''لوپانار'' لغوی معنی بھیڑیے کا غار کہتے تھے۔ اہل یونان کی طرح روم کے رئیس زادے اور اشرافیہ کے بچے تعلیم و تربیت اور شائستگی کے آداب سیکھنے کے لیے طوائفوں کے ہاں جاتے تھے۔ روم کے ایک مشہور شاعر کے بقول روم میں طوائفیں آسمان کے تاروں کی طرح بے شمار ہیں۔ کئی شہروں میں منڈی کے داروغے ہر روز برسرعام اجنبیوں کے ہاتھ طوائفوں کی خرچی نیلام کرتی تھے اور گاہکوں کو ایک ایک چھلا دیتے تھے۔ داروغے رات کو گشت کرتے اور طوائفوں کے محلوں میں چھاپے مارتے اور اگر کوئی شخص بغیر داروغے کے چھلے کے کسی طوائف کے ہاں پکڑا جاتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی۔ روم میں طوائفیں عموماً کنیزیں ہوتیں جن سے ان کے آقا پیشہ کرواتے۔

روم میں طوائفوں کو رکھنا ایک منافع بخش کاروبار تصور کیا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو جرنیلوں، جاگیرداروں، داروغوں اور اشرافیہ نے کنیزوں کے روپ میں طوائفوں کو اپنے پاس رکھا اور ان سے پیشہ کروایا۔ اس کے بعد پورے روم میں طوائفوں کے ذریعے کاروبار کرنے کا رواج عام ہوگیا۔ لوگوں نے سرائیں تعمیر کیں جہاں خصوصی طور پر طوائفوں کو رکھا جاتا۔ آتے جاتے مسافر ان طوائفوں کے ساتھ شب بسری کرتے اور معاوضہ ادا کرتے۔ مختلف شہروں میں تاجروں نے بڑے بڑے حمام تعمیر کروائے جہاں طوائفیں گاہکوں کی مالش کرتیں اور ساتھ ساتھ جسم فروشی کا دھندہ بھی جاری رہتا۔ یہاں تک کہ قبرستانوں میں بھی طوائفوں نے ڈیرے جما لیے اور گاہکوں

کو پھانس کر اپنا دھندہ چلانے لگیں۔

حملہ آوروں کے لشکروں میں طوائفوں کا ایک دستہ ساتھ ساتھ چلتا جاتا' یہ عورتیں گا نے گا کر اہل لشکر کی دل لگی کا سامان مہیا کرتیں اور فوجیوں کے حوصلے بڑھاتیں۔ جب لشکر کہیں پڑاؤ کرتا تو قافلہ سالار فوجی جوانوں میں ان کی باری کے مطابق طوائفیں تقسیم کرتا۔ ہر فوجی اپنے معاوضے میں سے ایک مخصوص شرح کے ساتھ کٹوتی کرواتا۔ کٹوتی کی اس رقم سے طوائفوں کی ضروریات پوری کی جاتیں۔ لشکروں کے ساتھ رہنے والی طوائفوں کی اکثریت فوجیوں کی بیواؤں کی اور ان کی لڑکیوں کی ہوتی تھی کیونکہ کفیل کی موت کی صورت میں اس کے خاندان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تھا اور اس کے لواحقین طوائفوں کے شعبے مین شامل ہونے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ بعض طوائفوں کو یہ ذمہ داری بھی سونپی جاتی کہ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں اور فوجیوں کے بچوں کو تعلیم دیں۔ ان لشکروں میں پلنے والی سازشیں بھی عموماً طوائفوں کے ذریعے پروان چڑھتیں۔ لشکر جس علاقے پر قبضہ کرتا وہاں سے ہاتھ آنے والی عورتوں کو طوائفوں میں شامل کر دیا جاتا۔ قدیم جنگجوؤں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہندوستان' روم اور شیراز کے علاقوں کی عورتوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا اور جنگجو سالار اپنے لشکر کے بہادروں کو ان علاقوں کی عورتیں بخش دیا کرتے تھے اور مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی ان علاقوں سے ہاتھ لگنے والی عورتوں کو ہی استعمال کیا جاتا۔

اگر جنگجو سپہ سالاروں اور حملہ آوروں کے لشکروں کا جائزہ لیا جائے تو ان لشکروں کی کامیابیوں اور ان کے اندرونی نظم و ضبط اور اتفاق کی ذمہ داری ذہین سرداروں اور ہوشیار طوائفوں کے سر ڈالی جاتی رہی ہے۔ یہ سردار اور طوائفیں عقل مندی کے ساتھ لشکروں کا انتظام سنبھالنے سے لے کر اندرونی نظم و ضبط کے تمام امور نپٹاتیں۔ جیسے رفتہ رفتہ سماج نے اس طرح کی عورتوں کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور ان کی الگ شناخت کے ساتھ ساتھ انہیں الگ آبادیوں کی طرف دھکیل دیا ہے یہ دراصل مذہب کی جدید ہیت کے زیراثر ممکن ہوا ہے۔ تمام مذاہب نے

مقابلے کی فضا میں اپنے ساتھ نتھی برائیوں کو خود سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور مذہب کو آلائشوں سے پاک بنانے کی اس کوشش کے دوران اس کو بہت سے ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑا ہے۔ جدید مذاہب نے یہاں تک پیش رفت کی ہے کہ ایسی روایات سے انحراف کیا جائے جو اس کے اجزاء تک میں شامل رہی ہیں اور اس کی شناخت میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ لیکن چونکہ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق یہ روایات ناقابل قبول ٹھہرائی جا چکی تھیں اس لیے ان سے چھٹکارہ ناگزیر تھا۔

جہاں تک جسم فروشی کے دھندے کا تعلق قدیم مذاہب کے ساتھ ہے اس کے بارے میں قدرے وضاحت گزشتہ صفحات میں کردی گئی ہے۔ جسم فروشی کی اس روایت کو جنوبی ایشیائی ممالک میں جتھہ بند حملہ آوروں کی وجہ سے بھی بہت زیادہ فروغ ملا ہے۔ یہ حملہ آور چونکہ لوٹ مار کا ہدف لیکر وقتاً فوقتاً قدیم ہندوستان پر حملہ کرتے رہے اس لیے ان کی فوجیں بعض اوقات ناسازگار موسم یا حالات کے باعث دریاؤں اور شہروں کے کنارے پڑاؤ ڈالتیں جہاں ان کے فوجیوں کے لیے طوائفوں کی ضرورت پڑتی۔ یہ طوائفیں زیادہ تر مقامی علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں ان کا روزگار حملہ آور فوجیوں سے منسلک ہوتا۔ آج بھی اگر جسم فروشی کے قدیم بازاروں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بازار زیادہ تر فوجی قلعوں کی دیواروں کے ساتھ واقع ہیں۔ شروع میں یہ بازار عارضی ہوتے تھے کیونکہ جیسے ہی فوجی لشکر اس جگہ سے کوچ کرتا طوائفیں بھی اپنا سامان سمیٹ کر لشکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگتیں۔ جہاں لشکر کا پڑاؤ ہوتا وہیں ساتھ ہی طوائفیں بھی بیٹھ جاتیں۔

دیگر تہذیبوں کی طرح قدیم ہندوستان کی تہذیب میں بھی جسم فروشی قدیم ترین روایت کے طور پر موجود رہی ہے۔ قدیم ہندوستان میں عام طوائفوں اور کسبیوں کو روپا جیوا یا کلوٹا کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ ان میں اونچا طبقہ ویشیا اور نرتکی (گانے بجانے والیاں) عورتوں کا تھا۔ پڑھی لکھی اور مہذب طوائفوں کو گنیکا بھی کہا جاتا تھا۔ کوتلیہ چانکیہ کے مشہور ارتھ شاستر میں ہدایت کی گئی ہے کہ راجے مہاراجے

اپنے محلوں اور درباروں میں منتخب حسین طوائفیں رکھیں جو جلوس میں چھترا اٹھا کر چلیں۔ ناچ گا کر راجوں مہاراجوں کی دلجوئی کریں۔ ان کے جسم کی مالش کریں اور آرتی اتاریں۔ راجے مہاراجے جب دربار سے واپس آتے تو محلوں میں یہ طوائفیں انہیں نظر بد سے بچانے کے لیے آرتی اتارتی تھیں۔ ان طوائفوں کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی' ان کو سرکاری خزانے سے تحفے تحائف بھی دیئے جاتے اور سرکار کی طرف سے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے پنڈت مقرر کیے گئے تھے۔ اس دور میں طوائفوں کو ایک طرح عزت دی جاتی تھی اور ان کے پیشہ کو سرکار کی طرف سے سرپرستی حاصل ہو جانے کے بعد موروثی پیشہ کے طور پر دیکھا جاتا اور ان کی بددعا سے خصوصی طور پر بچنے کی کوشش کی جاتی۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ طوائفیں کسی بزرگ کی بددعا کے نتیجے میں اس پیشے سے وابستہ ہیں اور اس پیشے کے ساتھ نسل در نسل کی وابستگی کے باعث بددعا دینے والی بزرگ ہستی نے ان کی خطا معاف کر کے انہیں اپنی روحانی سرپرستی میں لے لیا ہے اور اگر ان کو تنگ کیا گیا یا ان کی دل آزاری کی گئی تو پھر ان کا روحانی سرپرست بزرگ معاف نہیں کرے گا۔ اس طرح کی اور اس سے ملتی جلتی درجنوں داستانیں طوائفوں اور ان کے پیشے کے بارے میں ہر دور میں مشہور رہیں۔

مذکورہ بالا روایت کے زیر اثر طوائفوں کے کئی خاندانوں نے بزرگوں کی درگاہوں اور مقبروں کے گردونواح میں اپنے گھر بنائے اور اس پیشے کو ایک قدیم مجبوری اور روحانی حوالے کے ساتھ زندہ رکھا۔ یہ طوائفیں بزرگوں کے سالانہ میلوں اور عرسوں کے مواقع پر مقبرے کے اردگرد منڈلاتی رہتیں اور میلے کے انتظامات میں حصہ لیتی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح بزرگ کی خدمت کرنے سے ان کے گناہ دھل جائیں گے اور جو گناہ وہ اگلے سال کریں گے وہ اگلے عرس صاف ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی درباروں اور مزاروں پر ہمیں طوائفوں کی اکثریت مل جاتی ہے جہاں وہ عقیدت مند کے طور پر حاضر ہوتی ہیں۔ عرس یا میلے کے موقع پر دل کھول کر اخراجات کرتی ہیں اور پیر کی خوشنودی کے لیے طرح طرح کے چڑھاوے

چڑھاتی ہیں اور منتیں مانگتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں لاتعداد ایسے مواقع بھی ملتے ہیں جہاں ان طوائفوں کو فوجیوں یا عام درباریوں کی خدمت کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایسا ہی ایک حکم کوتلیہ چانکیہ نے ان طوائفوں کو دیا جو اپنے گھروں میں پیشہ کراتی تھیں' کہ وہ بے چون و چرا تماش بینوں کو خوش کریں۔ جس طوائف سے کوئی تماش بین ناراض ہوگا اس کو جرمانہ کیا جائے گا۔ ہر طوائف اپنی دن بھر کی کمائی کا حساب کتاب سرکاری داروغہ کو دینے کی پابند تھی اور ہر ماہ اپنی ایک دن کی کمائی کا دگنا بطور محصول حکومت کو ادا کرنے کی پابند تھی۔ اسی طرح حکومت محصول کے بدلے میں رنڈیوں کی تربیت کا بھی اہتمام کرتی تھی۔ پیشہ ور اور تجربہ کار افراد کو رنڈیوں کی تعلیم و تربیت' ناچ گانے' دل لبھانے کا فن سکھانے اور سنگھار کرنے کے طریقے سکھانے کے لیے مقرر کرتی اور انہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی۔ بوڑھی طوائفوں کو وظیفہ دیا جاتا اور ان کو پابند بنایا جاتا کہ وہ امراء اور شرفاء کے بچوں کو آداب محفل سکھائیں گی۔ امراء کے بچے ان عورتوں سے رقص اور گانے کی تعلیم بھی حاصل کرتے اور ان بچوں کی سالگرہ اور شادی کے مواقع پر ان کی استاد طوائفوں کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا۔ یہ بہت آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں طوائف کے پیشے کو بہت زیادہ منظم کردیا گیا تھا اور اس کے ابتدائی قواعد وضوابط بھی طے کردیئے گئے تھے جن کی پابندی کرنا طوائفوں اور تماش بینوں کے لیے ضروری تھی اور خلاف ورزی کی صورت میں سرکار بھاری جرمانوں کے علاوہ شہر بدری کا حکم بھی جاری کرسکتی تھی۔

کوتلیہ چانکیہ نے جان بوجھ کر طوائفوں کو دبانے اور ان پر بعض پابندیاں لگانے کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے طوائفوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور اس کا پیشہ بہت زیادہ آزاد اور اشرافیہ کے قریب سمجھا جاتا تھا۔ کوتلیہ نے طوائفوں کو عام لوگوں کے قریب کردیا اور بڑی حد تک ان کو عام لوگوں کا مطیع اور پابند بنا دیا۔ کوتلیہ کا خیال تھا کہ اس طرح طوائفوں کے ساتھ زیادہ میل جول کے نتیجے میں عام لوگوں کی عادات پر فرق پڑے گا اور لوگوں کی زیادہ تعداد کو مہذب اور فعال شہری بنایا جاسکے گا چونکہ

ماضی میں دربار کے ساتھ قریب کے باعث طوائفوں کے مزاج درشت ہو چکے تھے اس لیے شروع میں ان کو کوتلیہ کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حکم کے نافذ ہونے کے بعد بہت دیر تک سرکار کی طرف سے عام لوگوں کے ساتھ بدتمیزی اور سختی کے ساتھ پیش آنے والی طوائفوں کو بھاری جرمانے کیے گئے اور کئی ایک کو شہر بدر بھی کر دیا گیا۔

سرکار کی طرف سے سرپرستی کے دور میں طوائفوں کے گھروں کی تعمیر کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے۔ سرکاری خزانے سے ان کے گھروں کی تزئین و آرائش کا کام مکمل کیا گیا اور ان کے گھروں کو ایک طرح سے تہذیبی و ثقافتی ورثے کے طور پر دیکھا گیا۔ اس دور کے مؤرخوں اور لکھاریوں کے ہاں طوائفوں کے مکانوں کے بارے میں لاتعداد تحریریں ملتی ہیں۔ ایک جگہ ایک مصنف لکھتا ہے ایک طوائف کا مکان کئی درجوں پر محیط ہوتا ہے' اس مکان کے آٹھ درجے ہیں جن میں پتھروں کی پچی کاری کی گئی ہے اور نہایت قیمتی قالین بچھائے گئے ہیں۔ دروازوں پر سونے کے پترے جڑے ہوئے ہیں۔ سنگ مرمر کے زینوں سے مکان کو آراستہ کیا گیا ہے۔

مشہور مؤرخ اور محقق ڈی ڈی کوسمبی لکھتا ہے کہ کوتلیہ چانکیہ کے دور میں اور اس کے تقریباً ایک سو سال بعد تک طوائفوں کو امور سرکار میں بہت زیادہ دخیل اور قابل عزت و احترام قرار دیا جاتا رہا۔ طوائفوں سے سرکار ہزار طرح کے کام لیتی۔ کئی طوائفیں محض اس لیے محلوں میں بھرتی کر لی جاتیں کہ وہ رانیوں اور مہارانیوں کو اپنے شوہروں کے دل لبھانے کے گر سکھائیں۔ مہارانیوں کو جنسی ملاپ کی پیچیدگیوں سے آشنا کریں۔ کوسمبی کے بقول چونکہ قدیم ہند کے مذہب اور تہذیب کے مطابق بیوہ عورت کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی اس لیے وہ معاش کے ہاتھوں مجبور ہو کر طوائف بن جاتی اور بسا اوقات کئی بیوائیں جن کا تعلق شریف گھرانے سے ہوتا وہ محل کے اندر تک رسائی حاصل کر لیتی اور رانیوں مہارانیوں کی خدمت کر کے اور ان کو تعلیم دے کر اپنی باقی زندگی عیش و آرام میں گزارتیں۔

اوریحان البیرونی کتاب الہند میں لکھتا ہے کہ ہندو راجے طوائفوں کو اپنے

شہروں کے لیے باعث زینت سمجھتے تھے اور انہیں رعایا کے لیے عیش وعشرت کا سامان تصور کرتے تھے۔ ان طوائفوں پر جو محصول لگایا جاتا یا جو جرمانے کیے جاتے اس کی رقم سے راجے اپنی فوج بھرتی کرتے۔ معروف مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے۔

''سلطان علاؤالدین خلجی نے بازار کی تمام اجناس و اشیاء کے نرخ مقرر کیے حکم عدولی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایک دن ایک درباری نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور نے سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور مقبول جنس کو تو نظر انداز کر دیا ہے۔ سلطان نے چیں بچیں ہو کر پوچھا: کون سی جنس؟ درباری نے کہا: حسن و شباب۔ سلطان سمجھ گیا اور مسکرانے لگا۔ اس کی ہدایت کے مطابق تمام کسبیوں کو عمر اور حسن و جمال کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور ان کی خرچی مقرر کی گئی۔ پھر فرمان جاری کیا کہ جو کسبیاں مقررہ شرح سے زیادہ رقم وصول کریں گی انہیں سخت سزا دی جائے گی۔''

جسم فروشی کی سرکاری سرپرستی میں آگے بڑھنے کی داستان بہت طویل ہے۔ ہندو راجوں' مہاراجوں' مسلمان حملہ آوروں اور مسلمان بادشاہوں نے اپنی اپنی ریاستوں' محلوں اور درباروں میں اس روایت کو اپنے اپنے انداز میں زندہ رکھنے کی کوشش کی اور اس پیشے کے ساتھ منسلک لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی وقتاً فوقتاً اقدامات کیے۔ فیروز شاہ تغلق نے جسم فروشی کے انسداد کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کہا:

''میں نے زنانِ بازاری کا جو علانیہ فحش کرتی تھیں نکاح کرنے کا حکم دیا لیکن اراکین نے عرض کی کہ اگر ان کا نکاح کر دیا گیا تو اکثر شہری شادی شدہ عورتوں سے بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا میں نے سکوت اختیار کیا۔''

مغل بادشاہوں نے خصوصی طور پر طوائفوں کی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا اور ان کو شہزادوں کی تعلیم و تربیت پر معمور کیا۔ طوائفوں کو جو اعلیٰ تعلیم و تربیت کی حامل ہوتیں درباروں اور محلوں میں داخلے کی خصوصی اجازت حاصل تھی۔ وہ امور سلطنت میں بھی دخل دیتیں اور محلوں کے اندر برپا ہونے والی سازشوں میں بھی ان کا

خصوصی حصہ ہوتا۔ خواجہ سراؤں کے ساتھ مل کر طوائفیں اپنے من پسند شاہزادوں کے لیے سازشیں کرتیں اور بعض اوقات سازشوں کے بے نقاب ہونے کے بعد طوائفوں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا گیا اور لمبی مدت کی قید کی سزائیں بھی سنائیں گئی۔ جلال الدین اکبر نے طوائفوں کے لیے ایک خاص بستی شیطان پورہ کے نام سے بنائی۔ شیطان پورہ کا رخ کرنے والوں کو اپنا نام اور پتہ لکھوانا پڑتا تھا۔ ازالہ بکارت کے لیے سرکار سے بطور خاص اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار اکبر نوجوان طوائفوں کو اپنے پاس بلا لیتا اور ان سے کرید کرید کر پوچھا کرتا تھا کہ تمہاری دوشیزگی کس نے غارت کی تھی۔ وہ نام بتاتیں تو ان مردوں کو خواہ وہ اس کے درباری ہوتے سزا دیتا تھا۔ اسی طرح بیجاپور کے احوال میں اسد بیگ لکھتا ہے:

''بازار میں ایک طرف شراب فروشوں کی دکانیں تھیں اور دوسری طرف رنڈیاں ہار سنگھار کرکے بیٹھتی تھیں۔ اس بازار میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ شراب خانوں میں بیٹھ کر مزے سے پیتے تھے۔ ناچنے گانے والیوں کے کوٹھوں پر ہر وقت جمگھٹ رہتا تھا۔''

اس پیشے کی سب سے تیز ترقی کا دور مغلیہ دور ہے۔ مغلیہ دور میں اکثر بادشاہوں نے اس پیشے کو ایک ثقافتی ورثے کا درجہ دیا اور اس کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا۔ جس کی بدولت یہ پیشہ دن بدن ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔

معروف سیاح اور مؤرخ تیورنیئر اپنی کتاب ''سیاحت ہند'' میں لکھتا ہے:

''گولکنڈہ کے مضافات اور قلعے میں جو بذات خود ایک شہر ہے ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار سے زائد کسبیاں رہتی ہیں جن کے نام داروغہ کے رجسٹر میں درج ہیں۔ یہ پیشہ اختیار کرنے کے لیے انہیں رجسٹر میں نام لکھوانا پڑتا ہے۔ ان سے بادشاہ کوئی محصول نہیں لیتا البتہ ہر جمعہ کے دن ان میں سے بعض کو اپنی نائیکہ اور سازندوں کے ساتھ شاہی جھروکے کے سامنے چوک میں حاضری دینا پڑتی۔ بادشاہ جھروکے میں بیٹھا ہو تو وہ مجرا کرتی ہیں، نہ ہو تو ایک خواجہ سرا انہیں واپس چلے جانے کا اشارہ کر دیتا ہے۔ شام کے وقت جب ہوا میں خنکی ہوتی ہے وہ اپنے مکانوں کے

دروازوں میں بیٹھتی ہیں۔ یہ مکان جھونپڑے کی وضع کے ہوتے ہیں۔ رات کے وقت وہ اپنے دروازوں میں شمعیں یا دیئے روشن کر کے رکھتی ہیں جو گویا دعوت کا اشارہ ہوتا ہے۔ اسی وقت تاڑی کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ تاڑی ایک درخت کا مشروب ہے۔ ہر روز پانچ چھ سو گھوڑے تاڑی کی مشکوں سے لدے ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں بادشاہ کو تاڑی کے محصول سے خاصی رقم وصول ہوتی ہے۔ اسی آمدنی کی خاطر اتنی بڑی تعداد میں کسبیوں کو پیشہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ انہی کسبیوں کی بدولت تاڑی کی کھپت ہوتی ہے۔ تاڑی بیچنے والوں نے اپنی دکانیں کسبیوں کی بستی کے قریب کھول رکھی ہیں۔ یہ عورتیں اس قدر سبک خرام اور چاق و چوبند ہوتی ہیں کہ جب شاہ وقت نے مسولی پٹم جانے کا ارادہ کیا تو نو کسبیوں نے مل کر ہاتھی کی شکل بنائی۔ چار عورتیں پاؤں بنیں، چار نے جسم بنایا، ایک سونڈ بن گئی۔ ان کے اوپر ایک تخت بچھایا گیا۔ اس سواری پر بادشاہ سلامت شہر میں داخل ہوئے۔"

طوائفوں کی بستی کو عموماً دوسرے شہروں کی آبادی سے الگ بسایا گیا۔ اس کی خاص وجہ بادشاہ کی طرف سے وہ تفریق تھی جو وہ عام شہریوں کو طوائفوں کے خاندانوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ بادشاہ کی اصل منشا یہ ہوتی کہ طوائفیں باعزت شہریوں کی خدمت کریں اور اس طرح لوگوں کو سرکار سے کوئی شکایت نہ رہے اور عام شہری طوائفوں کو اپنے لیے تفریح اور دل بہلانے کا سامان سمجھیں۔ اسی خیال کے تحت طوائفوں کے بازاروں میں جانے والوں کو خاص دعائیں دی جاتیں اور انہیں ترغیب دی جاتی کہ وہ روزانہ طوائفوں کے پاس جائیں۔ اس سے نہ صرف بادشاہ کو اصل ہونے والے محصولات میں اضافہ ہوتا بلکہ آبادی کے ایک بڑے حصے کو معاش میسر آتا۔ نواب شجاع الدولہ طوائفوں کا بہت زیادہ دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں دور دور سے طوائفیں لکھنؤ میں آتیں۔ لکھنؤ کی طوائفیں تین ٹکڑوں میں منقسم تھیں۔ (1) کنچنیاں: پیشہ ور ہندو کسبیاں تھیں جو ناچنے کی ماہر تھیں۔ (2) چونہ والیاں اور (3) ناگریناں۔ ان میں ہر قسم کی عورتیں تھیں۔ اونچے درجے کی طوائفیں ڈیرہ دار کہلاتیں۔ ان کے کوٹھوں پر نوچیوں کو ناچ گانے کے ساتھ ادب و شعر کی تعلیم بھی دلائی جاتی

تھی۔ طوائفوں کے آداب کو سند کا درجہ دیا جاتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ آدمی جب تک رنڈی کی صحبت میں نہ بیٹھے انسان نہیں بنتا۔ لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائف اور اس کے مکان کی تصویر مرزا ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں اس طرح ہے:

''خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں اُن کا سن قریب پچاس برس کا تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے کا مشروع پائجامہ' بڑے بڑے پائنچے' ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے' کانوں میں سادی دوانتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ مرزا رسوا! صاحب خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا کس قدر وسیع تھا۔ کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں۔ خانم کی نوچیاں رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی ان کے علاوہ دس بارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کاروبار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ' ہر وقت بنی ٹھنی تولواں جوڑا پہنے۔ سادہ کپڑے جو ہم لوگ پہنتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں بھی نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ پرستان تھا۔ جس کمرے میں جانکلو سوائے ہنسی مذاق' گانے بجانے کے کوئی اور چرچہ نہ تھا۔ ایک دن خانم صاحب کے سامنے رام کلی گا رہی تھی۔ دھیوت سدھ لگا گئی' استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسے کہلوایا میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے گھور کر دیکھا' میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی' انہوں نے سر جھکا لیا' پھر تو خانم صاحب نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔'' یہ ایک چھوٹا سا نمونہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ اور دوسرے ہندوستانی شہروں میں طوائفوں کا کاروبار کس حد تک وسیع تھا اور ان کو امور سلطنت میں کتنا دخل حاصل تھا۔

حکمرانوں کے ساتھ طوائفوں کا براہ راست رابطہ رہتا اور وہ نہ صرف

حکمرانوں کو خوش کر کے اپنے کام نکلواتیں بلکہ اشرافیہ میں سے بھی کئی ان کے مرہون منت ہوتے کہ وہ ان کے کام آتیں۔ طوائفوں کو ہندوستان کی تاریخ سے نہیں نکالا جاسکتا اور نہ ہی ان کی اہمیت کو کم کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی اشرافیہ کی کئی نسلوں کو طوائفوں کے ہاں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ کئی شہزادے اور حکمران طوائفوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد تخت نشین ہوئے اور انہوں نے اپنے ادوار میں ان طوائفوں کو انعام واکرام دیا اور محلوں کے اندر ان کو اختیارات دیئے۔

ساری دنیا کی تہذیبوں کی طرح برصغیر میں بھی جسم فروشی کی روایت آگے بڑھی اور نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس نے اپنے آپ کو ڈھالا۔ راجوں' مہاراجوں اور بادشاہوں کے ادوار کے خاتمے کے بعد اس روایت کو سرپرستی کے شدید فقدان کا سامنا کرنا پڑا لیکن جلد ہی اس روایت نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ جسم فروش عورتوں کے لیے الگ جگہوں کا انتخاب کیا گیا اور اس پیشے کو تحفظ دینے کے لیے اور اس سے متعلقہ خاندانوں کے لیے کچھ قواعد وضوابط مقرر کردیئے گئے۔

انگریزوں کی آمد کے بعد جسم فروشی کے پیشے نے خاطر خواہ ترقی کی اور طوائفوں کے بازاروں کے باقاعدہ اوقات مقرر کردیئے گئے۔ دگرگوں معاشی حالات کے باعث طوائفوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ کاروبار روایتی بازاروں کی حدود سے باہر نکلنے لگا۔ شورش کے زمانے کے راجوں مہاراجوں نے بھی طوائفوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے باقاعدہ فنڈز مقرر کیے۔ دوسری طرف غیر منقسم ہندوستان میں عوام کا رجحان تیزی کے ساتھ مذہب کی طرف ہونے لگا تھا اور اس رجحان سے جسم فروشی کے دھندے کو خطرہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں ملکوں کے بڑے اور چھوٹے شہروں میں جسم فروشی کے بازار موجود ہیں اور طوائفیں اپنا پیشہ کرتی ہیں۔

مجاہد حسین

پہلا حصہ

جسم فروشی کے اسباب

پہلا باب

جسم فروشی کی تعریف

کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے اس کی تعریف متعین نہ کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔ جسم فروشی پر لکھنے سے پہلے ہمیں درست طور پر طے کرنا ہوگا کہ طوائف کون ہوتی ہے۔

ماضی میں اس موضوع پر لکھنے والوں نے طوائف کی تعریف مختلف انداز سے بیان کی ہے۔ 1851ء میں پال لیکرائیکس نے لکھا کہ ایسی تمام عورتیں، جو شادی کیے بغیر یا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد کے ساتھ جنسی عمل کرتی ہیں، طوائف ہوتی ہیں۔ اس سے قبل 1842ء میں وارڈلا نے جسم فروشی کی تعریف متعین کرتے ہوئے اسے ''مرد و زن کا غیر قانونی جنسی اختلاط'' قرار دیا تھا۔ دوسری طرف طوائف کے حوالے سے یہ تصور معروف ہے کہ وہ ایک ایسی عورت ہوتی ہے جو اپنا جسم رقم کے عوض مختلف مردوں کو عارضی طور پر استعمال کرنے کے لیے سونپ دیتی ہے۔ یہ تصور واضح طور پر محدود ہے۔ ویبسٹر ڈکشنری میں بھی جسم فروشی کا یہی مطلب درج ہے یعنی عورت کا اپنا جسم کرائے پر دینا۔ ہمارے خیال میں دو مردوں کا باہمی جنسی تعلق بھی جسم فروشی کے زمرے میں آتا ہے۔

یہ امر اہمیت کا حامل ہے کہ ایک مسٹریس (Mistress) اور طوائف میں بھی اسی طرح فرق ملحوظ رکھنا چاہیے جس طرح کہ ایک شادی شدہ عورت اور طوائف میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ایسی عورت جو کسی مرد کے ساتھ شادی کیے بغیر خاص عرصے تک

رہتی ہے اور بعدازاں کسی دوسرے مرد کے ساتھ اسی انداز میں رہنے لگتی ہے' اسے مسٹریس کہا جاتا ہے۔ ایسی عورت کو طوائف کہنا درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسی عورت جو کسی مرد سے طلاق لے کر دوسرے مرد کے ساتھ شادی کر لیتی ہے' طوائف ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے مسٹریس پہلے طوائف رہی ہو یا بعدازاں طوائف بن جائے' تاہم اس سے ہمارے مؤقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا مسٹریسوں (Mistresses) کو طوائفوں کے زمرے میں شامل کرنا جسم فروشی کی تعریف میں توسیع کے مترادف ہے۔ ممکن ہے انگلستان میں مذکورہ بالا فرق کی کوئی زیادہ عملی اہمیت نہیں ہو' تاہم جن ملکوں میں جسم بیچنے والی عورتوں پر طوائف کا لفظ چسپاں کر دیا جاتا ہے' وہاں اس فرق کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

دوسری طرف جسم فروشی کو ایسی عورتوں تک محدود کرنا بھی اس پیشے کی درست تعریف نہیں ہے' جو کہ ناجائز جنسی تعلقات کے ذریعے اپنی روزی حاصل کرتی ہیں۔ یہ تعریف محدود اور غیر منطقی ہے۔ غیر پیشہ ور اور پیشہ ور طوائف میں ہمیشہ رقم کو فرق تصور کیا جاتا ہے۔ گہرا تجزیہ کیا جائے تو یہ فرق لایعنی ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سی عورتیں سکہ رائج الوقت کی بجائے کسی دوسری صورت میں معاوضہ حاصل کر کے ناجائز جنسی تعلقات قائم کر سکتی ہیں۔ رقم تو محض ایک علامت ہوتی ہے۔ پیشہ ور طوائف کے برعکس غیر پیشہ ور طوائف کا تو ایک خاص ''مقصد'' بھی ہوتا ہے۔ معروف تصور کے مطابق اگر کوئی مالی لین دین نہیں ہوا تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ کام بغیر کسی معاوضے کے ہوا ہوگا۔

یہ غیر پیشہ ور طوائفیں' جیسا کہ انہیں سہولت کے لیے کہا جاتا ہے' تمام مہذب ملکوں میں سال بہ سال تعداد کے اعتبار سے بڑھتی جا رہی ہیں اور پیشہ ور طوائفوں کے مخصوص حلقے میں مسلسل زیادہ سے زیادہ دخل اندازی کر رہی ہیں۔

معاشرے کے کسی معزز فرد کے ذہن میں جسم فروشی کے حوالے سے جو کراہت اور نفرت موجود ہوتی ہے' وہ حقیقتاً ہر سودے میں رونما ہونے والی شہوت میں موجود ہوتی ہے' حالانکہ ریاست اور چرچ کے زیرِسایہ ہونے والی شادیاں بھی حقیقت

میں ایسی ہی ایک تجارت ہوتی ہیں' تاہم اس حقیقت کو کبھی بیان نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح کا ایک اور نزاع یہ ہے کہ جس سودے میں مالی لین دین نہ ہو اُسے جسم فروشی نہیں کہا جاتا۔ یہ مفروضہ اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتا ہے کہ بہت سی شادیوں میں بھی مالی فائدے اور معاشی افادے کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔

طوائف کی قانونی تعریف کے برعکس اس لفظ کی ہر تعریف میں پیشہ ور اور غیر پیشہ ور دونوں طرح کی جسم فروش عورتوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ قانون — اور سب سے بڑھ کر چرچ اور عوام — اپنے فیصلوں میں مال و دولت کے عوض جسم فروشی کر کے روزی کمانے والی عورتوں کے علاوہ اور کسی کو شامل نہیں کرتے۔ ایک معروف مفروضہ ہے کہ شادی کی وجہ سے قانون کی تعبیر کے مطابق جسم فروشی کہلانے والے عمل کے وقوع کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔ یہ مفروضہ اخلاقی یا عمرانیاتی نکتۂ نظر کے موافق دکھائی نہیں دیتا ہے۔

جسم فروش عورت ناجائز جنسی عمل میں ملوث ہوتی ہے تو محبت یا جنسی جذبے کے علاوہ اس کا مقصد و محرک' کسی حد تک یا مکمل طور پر کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ طوائف شاذ و نادر ہی جنسی خواہشات کی اسیر ہوتی ہے' البتہ یہ الگ بات ہے کہ جنسی خواہشات کی اسیر کوئی عورت طوائف بن جائے۔ اس کے باوجود طوائف کے پیشہ ورانہ افعال میں محبت کی عدم موجودگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ محبت کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ طوائف کے حوالے سے دو مفروضے بہت مشہور ہیں۔ پہلا مفروضہ یہ ہے کہ ہر جسم فروش عورت جس قدر مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے ان کے لیے شہوت کا آتش فشاں ہوتی ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی فرد کے لیے محبت جیسا جذبہ بالکل نہیں رکھتی۔ یہ دونوں مفروضے غلط ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جسم فروش عورت کسی شدید جنسی خواہش کے بغیر اپنا جسم یکے بعد دیگرے بہت سے مردوں کو رقم کے عوض سونپ دیتی ہے' تاہم وہ کسی ایک مرد سے حقیقی محبت کرنے کی بھی اہل ہوتی ہے۔

بعض افراد کا کہنا ہے کہ محبت کے عنصر کی عدم موجودگی ایک ایسا بنیادی

عامل ہے' جو کہ عورت پر طوائف کا ٹھپہ لگا دیتا ہے۔ ایسے افراد کا یہ بھی کہنا ہے کہ جسم فروشی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ جسم فروش عورت اپنی جنسی مہمات سے کوئی لذت حاصل نہیں کرتی' اس کو تو صرف اپنی خدمات کے بدلے میں حاصل ہونے والی رقم سے دلچسپی ہوتی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ لفظ طوائف کی تعریف متعین کرتے ہوئے لذت یا عدم لذت کا سوال اٹھانا غیر منطقی ہے۔ مزید براں اس ''آفاقی بے حسی'' کی تائید میں بہت کم حقائق دستیاب ہیں اور جو معمولی شواہد وجود رکھتے ہیں وہ بھی انتہائی ناقابل اعتبار ہیں۔ ہم سب اس حقیقت سے خوب آگاہ ہیں کہ کسی بھی لذت انگیز عمل کو بار بار کیا جائے تو اس کا مخصوص مزا ختم ہو کر رہ جاتا ہے چنانچہ اس امر میں ذرا سا بھی شبہ نہیں ہے کہ کئی برسوں سے جسم فروشی کرتی چلی آنے والی عورت کے لیے جنسی تعلقات میں کوئی لذت نہیں رہ جاتی' کیونکہ جنسی عمل اس کے لیے معمول بن چکا ہوتا ہے۔ تاہم کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ بہت سی شادی شدہ عورتیں بھی اپنے شوہروں کے ساتھ مسلسل کئی برسوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے چلے آنے کی وجہ سے جنسی عمل سے لذت حاصل کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا جسم فروش عورت اپنے پیشے کے آغاز کے وقت جنسی عمل سے لذت حاصل کرتی ہے؟ میں اس سوال کا یہ جواب دینے کی جسارت کرتا ہوں کہ دس میں سے نو طوائفیں اس پیشے کے آغاز کے وقت جنسی عمل سے لذت حاصل کرتی ہیں۔ اکثر طوائفیں کاروبار اور لذت کا امتزاج کر لیتی ہیں اور جنسی عمل کے لیے ایسے گاہکوں کا انتخاب کرتی ہیں جن سے انہیں لذت بھی حاصل ہوتی ہے اور رقم یا اس کا متبادل معاوضے کے طور پر بھی حاصل ہوتا ہے۔

جنسی عمل سے حاصل ہونے والی لذت کا محبت سے تعلق ہونا ضروری نہیں ہے۔ محبت تو سراسر دوسری شے ہے۔ جنسی تسکین کے لیے طوائفوں کے ہاں جانے والے بیشتر مرد لذت تو حاصل کرتے ہیں تاہم ان میں سے چند ایک ہی کو ان عورتوں سے محبت ہوتی ہے جن کا بنیادی کردار جنسی لذت فراہم کرنے والے وسیلے کا ہوتا ہے۔ جب کوئی طوائف اپنے پیشے کا آغاز کر دیتی ہے تو اپنے دھندے کے دوران

اسے محبت جیسی کسی شے کا تجربہ شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ شادی شدہ عورت کے برعکس جسم فروش عورت اور مسٹریس رقم یا اس کے مساوی کسی شے کے عوض اپنا جسم مختلف مردوں کو استعمال کرنے کے لیے دیتی ہے اور اس عمل میں اسے محبت کا کوئی خیال تک نہیں ہوتا۔ بہت مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ اسے جنسی عمل کرنے والے مرد سے ناپسندیدگی بلکہ نفرت تک محسوس ہو رہی ہوتی ہے نیز وہ کسی طرح کی لذت بھی حاصل نہیں کر رہی ہوتی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے چونکہ وہ اس سودے میں اپنا کردار بھرپور اور بظاہر جذباتی انداز میں ادا کرتی ہے لہٰذا یہ امر اس کی شہوت پسندی یا ہوس پرستی کا ثبوت ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ وہ تو ایک پیشہ ور جسم فروش کی حیثیت سے فقط اپنا کردار پوری قوت سے ادا کر رہی ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بہت سی شادی شدہ عورتوں کو اپنے خاوندوں سے محبت نہیں ہوتی، حتیٰ کہ شادی کے وقت بھی انہیں ان سے کوئی محبت نہیں تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض عورتیں جن مردوں سے محبت کرتی ہیں، اُن سے شادی کے بعد وہ ان کے لیے جنسی اعتبار سے "ٹھنڈی" ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں شادی شدہ عورت اور طوائف میں فقط اتنا سا فرق رہ جاتا ہے کہ اس نے صرف "ایک" آدمی سے اپنے جسم کے استعمال کا معاہدہ کیا ہوتا ہے اور اس معاہدے کو ریاست اور چرچ کی طرف سے منظوری حاصل ہوتی ہے۔

یہاں مرد جسم فروش (Male Prostitute) کا بھی سوال ہے۔ جسم فروشی صرف اور صرف عورت ہی کا پیشہ نہیں ہے، نہ ہی ایسا ہے کہ صرف مرد طوائفوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مرد جسم فروشوں کو، جنہیں عام طور پر گیگولو (Gigolo) کہا جاتا ہے، عورتیں ملازم رکھتی ہیں اور انہیں باقاعدہ معاوضے ادا کرتی ہیں۔ کج رو اور ہم جنس پرست مرد ایسے مرد جسم فروشوں کو ملازم رکھتے ہیں، جو کہ مفعول ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں جسم فروش کی تعریف متعین کرتے ہوئے دونوں اصناف کو شامل کرنا ہوگا اور اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے نیز اپنی گزشتہ آراء کو پیش نظر رکھ کر ہم درج ذیل تعریف متعین کرتے ہیں:

''ایک ایسا فرد' مرد یا عورت' جو کہ مالی یا کسی اور طرح کے معاوضے کے بدلے' یا محبت سے عاری لذت کے حصول کے لیے جسم فروشی کو جز وقتی (پارٹ ٹائم) یا کل وقتی پیشے کے طور پر اپنا لے اور لاتعداد لوگوں کے ساتھ نارمل یا ابنارمل جنسی عمل میں حصہ لے' خواہ ان کا تعلق اس کی اپنی صنف سے ہی ہو' اسے طوائف کہتے ہیں۔''

مذکورہ بالا تعریف متعین کرنے کے بعد ہم آئندہ صفحات میں صرف جسم فروش عورتوں کے حوالے سے اس قدیم پیشے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

دوسرا باب

طوائف اور معاشرہ

آج بیشتر نہیں تو بہت سے معزز مرد و خواتین جسم فروش عورتوں کو حقارت یا رحم یا دونوں طرح کے احساسات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس پیشے کے وجود کے بڑی حد تک ذمہ دار مرد بھی طوائفوں کا تذکرہ نفرت و حقارت کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر کوئی ایسی جسم فروش عورت ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے آجائے جس کے ساتھ انہوں نے گزشتہ رات بسر کی ہو تو وہ اسے مکمل سرد مہری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جسم فروش عورتیں مہیا کرنے والے قہوہ خانوں اور شبینہ کلبوں میں آمد و رفت نہیں رکھتے۔ طوائف کو عمومی طور پر ایک ''اخلاقی اچھوت'' سمجھا جاتا ہے اور تکلف برطرف اس کے حوالے سے مہذب معاشرے کا ردعمل کسی ''خاندانی مسئلے'' کو شائستگی سے دفنا دیئے جانے والے ردعمل سے مشابہہ ہوتا ہے۔ طوائف کے حوالے سے یہ طرزِ عمل آفاقی اور اتنا وسیع ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں یہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ جسم فروشی کا دھندا ہمیشہ شرمناک پیشہ نہیں رہا ہے۔ اس کے برعکس ایک زمانے میں تو طوائف کو احترام کے قابل اور تعریف و ستائش کی اہل مانا جاتا تھا۔ جیسا کہ بائبل اور اس کے معاصر ادب سے واقف لوگوں کو بخوبی علم ہوگا۔ لارڈ ایوبری کے بقول حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانے میں بعض خاص اقوام میں طوائفوں کو قانونی طور پر شادی شدہ عورتوں سے زیادہ قدر و منزلت اور عزت حاصل ہوتی تھی۔ ایتھنز میں طوائف کا رتبہ سب سے

اعلیٰ ہوتا تھا۔ ویسالی میں ''کنیزوں کی سردارنی'' کو اعلیٰ نسبی کی سند دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ موجودہ دور کے جاپان میں' اور کچھ خاص قدیم اقوام میں' جسم فروشی کو شرم ناک پیشہ نہیں مانا جاتا۔

بائبل میں جن کیڈی شوتھوں کا تذکرہ ہے' ان کا تعلق کنعانیوں کے معبدوں سے ہوتا تھا اور پرستش کے لیے آنے والے انہیں عزت کے اعلیٰ ترین منصب کی حامل مانتے تھے۔ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں معبدوں کی طوائفوں کی سب سے زیادہ عزت کی جاتی تھی اور جہاں ان کا معبد سے تعلق عارضی ہوتا تھا' وہاں لوگ ان سے شادی کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے تھے۔ سٹریبو کے بقول قدیم امریکی اپنی بیٹیوں کو طوائف کے طور پر معبدوں میں دیوتاؤں کے حضور پیش کردیا کرتے تھے۔ یہ طوائفیں عارضی طور پر دیوتا کے حضور پیش کی جاتی تھیں اور بعدازاں کوئی شخص بھی ان کے ساتھ شادی کرنے میں معمولی سی بھی جھجک کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح بابل میں بھی معبدوں کی طوائفوں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس انہیں ایسی عظیم عورتیں مانا جاتا تھا جو مذہب سے وابستگی کے اظہار کے لیے اپنی زندگیاں دیوتاؤں کی خدمت کے لیے وقف کردیتی ہیں اور ان کی اتنی عزت اور اس قدر احترام کیا جاتا تھا جتنا کہ اعلیٰ ترین حلقوں میں موجود افراد کا۔

ان سب مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کے لائسنس کے ساتھ ہونے والے جسم فروشی کے دھندے کو جس زاویے سے دیکھا جاتا تھا' موجودہ زمانے میں وہ زاویۂ نظر تبدیل ہوگیا ہے۔ تاہم جب میں اس تحقیق کے اگلے مراحل میں پہنچوں گا تو اس مقدس جسم فروشی کے حوالے سے تفصیل سے لکھوں گا۔

جاپان میں طوائف[1] کو اس طرح حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جیسا کہ یورپی ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے حوالے سے کوئی گھٹیا یا حقارت آمیز الفاظ بالکل استعمال نہیں کیے جاتے۔ مثال کے طور پر جاپانی زبان میں طوائف کا لفظ نہیں ہے۔ اس کے بجائے جسم فروش عورت کے لیے جاپانی زبان میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے اس کا مفہوم ہے ''عارضی بیوی۔'' جاپان میں ایسی بہت سی لڑکیوں نے' جو کہ

لذت گاہوں سے منسلک تھیں، بعد میں شادیاں کرلیں اور انتہائی معززانہ انداز میں زندگی بسر کرتی رہیں۔

ہندوستان میں جسم فروش عورت کو کبھی ایک ذلیل یا اخلاق باختہ مخلوق نہیں سمجھا گیا۔ میئر کے بقول ''ہندو ہمیشہ عوامی عورت کی خوبیوں کے گیت گاتے اور اُسے ایک مثالی عورت کی تجسیم قرار دیتے رہے ہیں۔''

(Johann Jakob Meyer, Sexual Life In Ancient India, Routledge, 1930, Vol I, P.264)

شادی کے بغیر جنسی عمل کو گوارا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی قدیم اقوام کے مرد نہ تو کنوارپنے کو اہمیت دیتے تھے اور نہ ہی کسی خاص عورت کے ساتھ جنسی تعلق رکھنے کو اپنا خصوصی حق سمجھتے تھے۔ بہت سے غیر تہذیب یافتہ قبیلوں میں اس امر کو عزت افزائی کی علامت سمجھا جاتا تھا کہ میزبان گھرانے کی لڑکی کا باپ یا خاوند کسی مرد مہمان کو اپنی بیٹی یا بیوی کے ساتھ شب بسری کی اجازت دے دے۔

تہذیب کے ظہور اور پدرسری نظام کے فروغ پانے سے اس قسم کی روایات ناقابل برداشت قرار پاگئیں۔ تاہم اس کی ایک صورت یوں برقرار رہی کہ بہت سے مہذب ملکوں میں معزز مرد مہمانوں کی عزت افزائی کرنے کے لیے ان کو تلذّذ حاصل کرنے کے واسطے اعلیٰ رتبے والی طوائفیں پیش کی جاتی تھیں۔ بادشاہ اپنے مہمانوں کو کنیزیں پیش کیا کرتے تھے۔ اس روایت کی شہادت یہ حقیقت ہے کہ ازمنہ وُسطیٰ میں جرمنی اور دوسرے ملکوں میں شاہی مہمانوں کو شہر کے چکلے میں مفت داخلے کا استحقاق ہوتا تھا۔ 1434ء میں بادشاہ سگسمنڈ کو اُلم کے دورے کے وقت طوائفوں کی معیت میں شہر کے دروازے سے محل تک لایا گیا تھا۔ سولہویں صدی میں سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ آنے والے ہر سفیر کی خاطر تواضع شہر کے حکام اور ان کی بیگمات کی بجائے شہر کے حکام اور شہر کے چکلوں سے چن کر لائی گئیں طوائفیں کرتی تھیں۔

اگرچہ موجودہ دور میں اس قسم کے کسی عمل کو گوارا نہیں سمجھا جاتا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ حالیہ برسوں میں بعض ملکوں میں کانفرنسوں اور میٹنگوں کے شرکاء کے لیے منتظمین نے طوائفیں فراہم کیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو اہم کاروباری

معاہدوں کے وقت ’’کال گرلز‘‘ مہیا کی جاتی ہیں تا کہ کاروباری تعلقات مزید بہتر ہوسکیں۔

جہاں انگلینڈ میں جسم فروش عورتوں کو حقارت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے وہاں یہ پرانا تصور بھی موجود ہے کہ ہر جسم فروش عورت لازماً گھٹیا ذہنیت اور کمزور ذہن کی حامل ہوتی ہے۔ جنس کے موضوع پر تحقیق کرنے والے روسی محقق ٹارنووسکی کا خیال تھا کہ پیشہ ور جسم فروش عورتیں موروثی طور پر نیز اپنی نشوونما محدود ہوجانے کی وجہ سے ذہنی اعتبار سے پست ہوتی ہیں۔ ماضی میں جنس کے موضوع پر تحقیق کرنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کا بھی خیال تھا کہ جسم فروش عورتیں ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں۔ تاہم میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ اس مفروضے کو رد کرنے کے لیے مضبوط ترین شواہد موجود ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا افراد نے اپنی رائے ان تحقیقات کی بنیاد پر قائم کی تھی جو سماجی‘ اخلاقی اور مذہبی کارکنوں نے کی تھیں یا ماضی میں میگڈالین ہسپتالوں‘ قید خانوں‘ امدادی مراکز اور ایسے ہی دوسرے مقامات سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار اس رائے کا باعث تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے صرف نچلے طبقے کی طوائفوں کے حوالے سے معلومات پر انحصار کرتے ہوئے مجموعی طور پر جسم فروشی کے پیشے کو حقیر قرار دے دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیشہ ایسی جسم فروش عورتیں موجود رہی ہیں جو نارمل ذہانت کی حامل تھیں اور جنہوں نے اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے مانند تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور یہ بھی لازماً تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ تعلیمی میدان میں ان سے زیادہ کامیاب بھی رہیں۔

جب بھی کوئی شخص پیشہ ور طوائف کے حوالے سے غور کرے گا اس کے ذہن میں ایسی عورتوں کے ساتھ معاشرے کا برتاؤ ضرور سوال اٹھائے گا۔ طوائف معاشرتی اعتبار سے اچھوت‘ حقارت انگیز اور نفرت کا ہدف ہوتی ہے۔ معاشرے کا ہر فرد‘ مرد و عورت‘ اس سے تعلق رکھنا برا سمجھتا ہے۔ ایسے مرد جو طوائفوں کے ساتھ مراسم رکھتے ہیں‘ وہ تنہائی میں تو ان سے ملنا پسند کرتے ہیں لیکن لوگوں کے درمیان وہ بھی ان کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ طوائفوں کے حوالے سے عورتوں کا رویہ بھی

مردوں سے تھوڑا سا ہی مختلف ہوتا ہے۔ عورت طوائف کو نہ صرف حقارت سے دیکھتی ہے بلکہ وہ اس سے نفرت اور حسد بھی کرتی ہے کیونکہ وہ اس کی کامیاب رقیب ہوتی ہے۔ شادی شدہ عورت اپنے آپ کو اس خیال سے نجات نہیں دلا سکتی کہ جسم فروش عورت شادی کے بغیر ایسی شے فراہم کر رہی ہے' جو کہ شادی کے معاہدے کا خصوصی جزو ہے یا ہونا چاہیے۔ غیر شادی شدہ عورت اس خیال سے پریشان رہتی ہے کہ طوائفیں اس کی شادی کے موقعے کو ضائع کر رہی ہیں۔

جسم فروشی سے وابستہ خوف محض لفظی ہے۔ اس دھندے سے وابستہ حقیقی بے راہروی کی بجائے لفظ طوائف حقارت کا احساس زیادہ پیدا کرتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اکثر اوقات ایک طوائف بھی طوائف کہے جانے پر غصے میں آ جاتی ہے اور اس لفظ کے حوالے سے کراہت کا اظہار کرتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں کہیں جسم فروشی کو تقدس حاصل تھا یا ہے' وہاں ایسی عورتوں کو طوائف نہیں کہا جاتا۔ چنانچہ کنعان' شام اور یونان میں معبدوں سے وابستہ جسم فروش عورتوں کو طوائف نہیں کہا جاتا تھا۔ اس کی بجائے انہیں ''پجارن'' کہا جاتا تھا۔ جسم فروش عورتوں کو طوائف کا نام یہودیوں نے دیا تھا۔ قدیم یونان میں ہیتاری کو نہ تو کبھی طوائف کہا جاتا تھا اور نہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح فرانس اور اٹلی میں سیلون چلانے والی کنیزوں اور مسٹریسوں کو حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یورپ کے دانش ور بھی ان کے سیلونوں میں آیا جایا کرتے تھے۔ یورپی بادشاہوں اور اشرافیہ کے ہاں بھی جسم فروش عورتوں کو بڑی عزت و تکریم حاصل ہوتی تھی۔

تیسرا باب

جسم فروشی کی بنیادی وجہ

جہاں تک عورتوں کی جسم فروشی کا تعلق ہے تو اس کی ذمہ دار عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ یہ جسم فروشی کی حیاتیاتی وجہ ہے۔ اگرچہ اس کو کھلم کھلا تو کبھی بیان نہیں کیا گیا ہے تاہم عملی طور پر یہ امر تسلیم شدہ ہے۔

عورتوں کو جسم فروشی کا پیشہ اپنانے پر مجبور کرنے والی وجوہات کو خود جسم فروشی کی بنیادی وجہ سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے' جو کہ ایک بہت مختلف شے ہے۔ جسم فروشی جوہری اعتبار سے جسمانی ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی کی وجہ وہ شدید جسمانی ضرورت ہے جو مرد کو اپنی ساتھی تلاش کرنے اور اس کے ساتھ جنسی عمل کرنے پر اکساتی ہے۔ سادہ الفاظ میں کہا جائے تو یہ ویسی ہی ضرورت ہوتی ہے جیسی کہ کسی کتے کو کتیا کے گرد گھومنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

گزشتہ دو ہزار برسوں کے دوران یہ حیاتیاتی ضرورت بے شمار مذہبی' اخلاقی اور سماجی لیڈروں کی طرف سے جسم فروشی کو شر قرار دلوانے کا باعث بنی — ایسا شر جس کو لازماً بھگتنا ہوگا' ایک ایسا سرطانی پھوڑا' جس کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ جس پر صرف نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔ ان کے ذہنوں میں ہمیشہ یہ خوف رہا تھا کہ فرض کیا جسم فروشی کو ختم کرنا ممکن ہو تو اس کے غائب ہونے سے یکے بعد دیگرے بدترین شر نمودار ہونے لگیں گے۔ اسی نکتہ' نظر کی وجہ سے حکومتیں امن اور جنگ کے دوران فوجیوں کی طوائف بازی کو گوارا کرتی ہیں اور حد تو یہ ہے کہ بعض اوقات غیر ملکوں میں

بھیجے گئے فوجیوں کے لیے چکلوں کا اہتمام کرتی ہیں۔

جسم فروشی ہر زمانے میں ایک پیچیدہ مسئلہ رہی ہے۔ ساری دنیا میں اس سے زیادہ کسی موضوع کے حوالے سے مذہبی پیشواؤں اور عوامی اخلاق کے خودساختہ سرپرستوں نے منافقت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان کی مشکل یہ تھی اور ہے کہ وہ کسی ایسی شے کی مذمت کو باجواز قرار دیں' جس کے حوالے سے وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ اسے دبانا ممکن نہیں ہے۔ ان کی دشواری یہ بھی رہی ہے کہ دو فریقوں کے مابین ہونے والے معاہدے (جس کو شر تسلیم کیا جاتا ہے) میں صرف ایک فریق کا سزا اور تذلیل کا مستحق ہونا کس طرح باجواز قرار دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم فروشی اس لیے موجود ہے کہ اس کو قتل' چوری یا شیر خوار بچوں کے قتل کی طرح دبایا نہیں جاسکتا بلکہ اس کی موجودگی کی وجہ یہ ہے کہ اس کو دبانے کی کبھی سنجیدگی کے ساتھ کوشش ہی نہیں کی گئی۔ بعض ملکوں میں کھلے عام جسم فروشی ہوتی ہے اور بعض ملکوں میں اسے ایک لعنت قرار دے کر اس پر پابندیاں لگائی گئی ہیں اور کسی حد تک محدود کر دیا گیا ہے' تاہم اسے سختی سے دبایا نہیں گیا۔

جسم فروشی کی مذمت اور ساتھ ہی اس کو صرف نیم دلی سے محدود کرنے کی کوششوں کے حوالے سے بہت سے جواز پیش کیے جاتے ہیں۔ اس شر کو برداشت کرنے کے لیے بنیادی جواز سات سو سال پہلے سینٹ آگسٹین نے مہیا کیے تھے' جن کو جدید ملمع کاری کر کے آج بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ طوائف معاشرے کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ بے شک وہ گناہگار ہے' اخلاقی اعتبار سے کج رو ہے' بدکار ہے' فاحشہ ہے' تاہم ہوس کو حدوں میں رکھنے کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ سینٹ آگسٹین سے پہلے سینٹ پال نے کہا تھا اگرچہ جنسی عمل گناہ ہوتا ہے تاہم ''جلنے'' سے شادی کر لینا بہتر ہے' لہٰذا سینٹ آگسٹین کا کہنا تھا کہ بدکاری گناہ ہے تاہم مرد کے لیے بہتر ہے کہ وہ کسی معزز عورت کے ساتھ زنا کرنے کی بجائے کسی طوائف کے ساتھ جنسی عمل کر لے۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''طوائف سے زیادہ غلیظ کون ہے؟ تاہم انہیں معاشرے سے

نکال دو گے تو ہر طرف ہوس کے داغ نمایاں ہو جائیں گے۔
پس یہ طبقہ اپنے تمام تر شرمناک افعال کے باوجود قوانین کے
تحت ایک نہایت گندے مقصد کو پورا کرتا ہے۔''

اسی طرح ایتھنیس کے بقول سولن نے معزز عورتوں کو زنا سے محفوظ رکھنے کے مقصد کے تحت عورت غلاموں کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا تھا۔ سالویانس لکھتا ہے کہ رومنوں نے معزز عورتوں کے زنا سے تحفظ کے لیے چکلے قائم کیے ہوئے تھے۔

تاہم مجموعی طور پر سینٹ آگسٹین کے بعد سے مذہبی پیشوا شادی کے علاوہ ہر طرح کے جنسی تعلقات کی مذمت کرتے آئے ہیں اور جہاں واضح رائے کا اظہار ضروری ہو وہاں واضح طور پر جسم فروشی کی مذمت کرتے آئے ہیں۔ سینٹ پال اور اس کے معاصرین کے خیالات کو نظر انداز کر کے صرف شادی کو تقدس دیا گیا اور اس کے علاوہ ہر قسمی جنسی تعلق کو ممنوع قرار دیا گیا۔ جسم فروشی کو فحاشی و بدکاری قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مذمت کی گئی۔

اٹھارہویں صدی کے اوائل تک صورتحال ایسی ہی رہی تاوقتیکہ مینڈوائل نے اپنی بدنام زمانہ تحریر The Fable Of The Bees میں سینٹ آگسٹین کے اس فلسفے کو دوبارہ پیش کیا کہ نسائی اخلاق کے تحفظ کے حوالے سے معاشرہ طوائف کا مرہونِ احسان ہے۔ ایک صدی بعد اس تصور کو مزید فروغ ملا۔ شوپنہار نے کہا کہ طوائفیں ''یک زوجگی کی قربان گاہ پر ذبح ہونے والی'' مخلوق ہیں۔ لیکی نے طوائف کے وجود کو اس دلیل کے ساتھ جائز قرار دیا کہ وہ ''عصمت کی سب سے زیادہ مستعد سرپرست'' ہے۔ بالزاک نے Physiology Of Marriage میں طوائفوں کے بارے میں لکھا: ''وہ جمہوریہ کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیتی ہیں اور معزز خاندانوں کے تحفظ کے لیے اپنے جسموں کو ڈھال بنا دیتی ہیں۔'' دوسرے لکھنے والوں نے بھی ایسے ہی دلائل دیئے۔ شادی کے علاوہ بھی مرد کی جنسی ضرورت اور اس کی کثیر زوجگی کی فطرت نیز مرد سے عورت کا تحفظ دو ایسے دلائل تھے جنہیں جسم فروشی کے جواز پر ہونے والے ہر مباحثے میں پیش کیا جانے لگا تھا۔

یہ امر کس قدر حیرت کا باعث ہے کہ اس حقیقت کو کبھی نہ تو سمجھا گیا اور نہ اس کو تسلیم کیا گیا کہ جسم فروشی کے وجود کی اصل وجہ مرد ہے۔ یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی ہے کہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں نے عورت کی معاشی ضرورتوں کو جسم فروشی کی ایک بڑی وجہ قرار دیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ ایک اہم وجہ ہے تاہم بنیادی وجہ نہیں ہے۔ محنت کے روایتی طریقوں کے علاوہ کسی اور ذریعے سے روزی کمانے کی عورت کی ضرورت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسم فروشی کے پیشے کو موجود ہونا چاہیے۔ جسم فروشی کی حقیقی وجہ مرد کی جنسی بھوک ہے۔ یہ بھوک شادی کے بندھن کے بغیر جنسی عمل کی طلب کو جنم دیتی ہے۔ پیشہ ورانہ جسم فروشی اس حقیقت سے وجود میں آئی ہے کہ مرد اپنی جنسی ضرورتوں کی تسکین کے لیے معاوضہ ادا کرسکتا ہے۔ اگر مرد معاوضہ ادا کرنے سے قاصر یا اس کے لیے نارضامند ہوتا تو کہا جاسکتا ہے کہ پیشہ ور طوائفیں بھی نہ ہوتیں تاہم ایسی صورت میں زنا کے واقعات میں بے تحاشا اضافہ ہوجاتا۔ چنانچہ سینٹ آگسٹین، شوپنہار، لیکی اور بالزاک کے خیالات کا انحصار اس امر پر ہے کہ مرد اپنی لذت کا معاوضہ ادا کرسکتا ہو۔ اگر معاشی آسودگی کی وجہ سے جسم فروش عورتیں موجود نہ رہیں تو پھر یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ زنا کے واقعات روکنے کے لیے مفت عورتیں فراہم کریں، خواہ وہ کنیزوں کی صورت میں ہوں یا تنخواہ دار طوائفوں کی صورت میں۔

مرد جوہری اعتبار سے کثیر زوجی ہے اور تہذیب کی ترقی نے اس پیدائشی خصوصیت کو تقویت دی ہے۔ جس معاشرے میں مرد صرف مختصر تعداد میں کثیر زوجی یا متواتر شادیاں کرسکتے ہوں، وہاں باقی ماندہ اکثریت کے لیے پیشہ ور یا غیر پیشہ ور جسم فروش عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔

تہذیبی ترقی کا ہر مرحلہ مرد کی بدکاری کی حیاتیاتی طلب کو بڑھاتا ہے۔ جنسی تحریک تہذیب کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پالتو جانوروں کی جنسی بھوک جنگلی جانوروں کی نسبت بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ ہر زوآلوجسٹ (حیوانیات کا عالم) اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ

انسانی نوع کا سروکار دو بنیادی چیزوں سے ہے یعنی خوراک اور جنس، جیسا کہ مارکس نے واضح کیا تھا۔ جس قوم میں بقا کی جدوجہد مشکل ہوتی ہے، اس میں خوراک جنس پر غالب آ جاتی ہے۔ تہذیب میں، کہ جہاں خوراک لوگوں کی اکثریت کے لیے مسئلہ نہیں رہتی، جنس خوراک پر غالب آ جاتی ہے۔ ایسے جدید معاشرے جہاں معیارِ زندگی ہر دس سال کے عرصے میں مزید ترقی پا جاتا ہے، وہاں جنس غالب آتی جا رہی ہے۔ جیسا کہ موجودہ دور کے انگلینڈ اور امریکہ میں ہو رہا ہے۔ ایسے حالات میں کہ جب مردوں اور عورتوں کے مابین روابط زیادہ سے زیادہ قریبی اور کھلے ڈلے ہوتے جا رہے ہوں، جہاں جنسی کشش عورتوں کا فن قرار پا چکی ہو، ضبط دشوار سے دشوار تر ہو جاتا ہے۔ ضبط کے برے اثرات خود ضبط کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ جنسی اعتبار سے بھڑکی ہوئی قوم کو جبراً ضبط کروانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

چوتھا باب

عورت طوائف کیوں بنتی ہے؟

نام نہاد اخلاقی واعظوں کے بیانات کی بنیاد پر ایک مفروضہ بہت عام ہوگیا تھا کہ طوائفیں ایسی شرم ناک زندگی گزارنے پر اس لیے مجبور ہوئی تھیں کہ وہ ایک معزز قسم کا کام حاصل نہیں کرسکتی تھیں۔ طویل عرصے سے اس مفروضے کے موجود چلے آنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ پرانے مصنفین نے بعد میں آنے والے مصنفین کو گمراہ کیا مثلاً پیرینٹ ڈوکاٹیلے نے لکھا: ''روزگار کا نہ ملنا نیز کم اجرتیں جسم فروشی کی بنیادی وجہ ہیں۔'' سینگر تمام طوائفوں کو ''حالات کی ماری ہوئیں'' عورتیں مانتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ اس پیشے کو چھوڑ سکتی ہیں۔ انگلینڈ کی طوائفوں کے حوالے سے خاص طور پر بات کرنے والا مصنف شیر ویل لکھتا ہے کہ ''اخلاق تجارت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔''

جو شرائط سو سال پہلے لاگو ہوتی تھیں وہ اب لاگو نہیں ہوسکتیں۔ اس زمانے میں عورتوں کے لیے جو واحد معزز پیشہ میسر تھا' وہ شادی تھی۔ اس کا متبادل گھریلو ملازمہ کا پیشہ تھا' جو اس زمانے میں غلامی کے مترادف تھا۔ چنانچہ محنت کش طبقے کی ہزاروں عورتوں کے لیے' جو اتنی خوش قسمت نہیں تھیں کہ ان کی شادی ہوجاتی' گھریلو ملازمہ کے کام کا متبادل سوائے بازار میں بیٹھنے کے اور کوئی نہیں تھا۔ جنسی ہوس کا نشانہ بننے والی گھریلو ملازماؤں کی کہانیاں اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ کس طرح لڑکیوں نے فاقہ کشی سے بچنے کا کوئی دوسرا راستہ نہ پاکر جسم فروشی اختیار کی تھی۔ ایسا

لگتا ہے کہ پرانے مصنفوں نے اپنی تحقیق کے دوران اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ بازار میں بیٹھنے والی لڑکیوں کا بہت بڑا حصہ پہلے گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے۔ سینگر بتاتا ہے کہ نیویارک کی دو ہزار طوائفوں میں سے 933 پہلے گھریلو ملازمائیں ہوتی تھیں۔ دوسرے مصنفوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ طوائفوں کی اکثریت کا تعلق ملازمہ کا کام کرنے والے طبقے سے ہوتا ہے۔ مل بینک جیل کا نگران میرک لکھتا ہے کہ اسے اپنی ملازمت کے دوران 53 فیصد ایسی طوائفوں سے واسطہ پڑا جو کہ گھریلو ملازمہ رہ چکی تھیں۔ شیرویل بیان کرتا ہے کہ سالویشن آرمی کے اعداد و شمار کے مطابق 88 فیصد طوائفیں پہلے گھریلو ملازمہ رہ چکی تھیں۔ انہوں نے ملازمہ کی حیثیت سے ہی جسم فروشی کا آغاز کر دیا تھا۔ Downward Paths کے نامعلوم مصنفوں نے 1916ء میں لکھا ہے کہ 830 طوائفوں میں سے 293 پہلے گھریلو ملازمہ رہ چکی تھیں۔ ایسی بہت مثالیں ملتی ہیں کہ گھریلو ملازماؤں نے ملازمت چھوڑ کر جسم فروشی کا پیشہ اختیار کر لیا۔

تاہم یہ تو ماضی کا حال تھا۔ موجودہ دور میں کوئی لڑکی ملازمت بچانے میں ناکام رہنے کے بعد جسم فروشی کا پیشہ اختیار نہیں کرتی۔ رویوں میں تبدیلی کے باعث اب کسی ناجائز بچے کی ماں کو مطعون نہیں کیا جاتا۔ نیز عورت کو حاملہ ہونے سے محفوظ رکھنے والی ادویات کی عام دستیابی کی وجہ سے شادی کے بغیر حاملہ ہونے والی عورتوں کی تعداد میں کافی کمی آ گئی ہے۔

ان سب باتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسم فروشی کی بنیادی وجہ معاشی نہیں ہے۔ اس کی وجہ معاشی ہے۔ بیشتر لڑکیاں اپنی ملازمت سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے طوائف کا پیشہ اپنا لیتی ہیں۔ کم تنخواہ پانے والی لڑکیاں اپنے معاشی حالات میں تبدیلی کی بے پناہ خواہش مند ہوتی ہیں اور اس کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتیں۔ بعض لڑکیاں ایسے حالات میں کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جو جسم فروشی جتنے ہی بدتر ہوتے ہیں۔ بعض شادی شدہ عورتوں کے حالات اتنے ذلت آمیز ہوتے ہیں کہ ایک کامیاب طوائف بھی ان سے ناآشنا ہوگی۔

انگلینڈ اور اس جیسے دوسرے تہذیب یافتہ ملکوں میں 95 فیصد طوائفیں اس پیشے کا انتخاب ارادی طور پر کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس انتخاب کی وجوہات بہت سی ہوں نیز ماحول بھی اس پر اثرانداز ہوتا ہے' تاہم اس پیشے کا انتخاب دستیاب پیشوں کی دوسری صورتوں پر اسے ترجیح دے کر کیا جاتا ہے۔

جسم فروشی کے اسباب بہت سے ہیں۔ انسان کسی ایک سبب کو واحد سبب قرار نہیں دے سکتا۔ انسان کسی ایک سماجی خرابی کی نشاندہی نہیں کرسکتا کہ جس کی اصلاح اس سارے مسئلے کا حل ہو۔ تاہم لڑکیوں کو اس پیشے کی طرف مائل کرنے والا بڑا سبب تعیش پسندی اور کاہلی ہے۔ 1957ء میں Committee On Homosexual Offences And Prostitution کے عنوان سے لندن میں شائع ہونے والی رپورٹ میں کہا گیا ہے:

> ''ہمارا تاثر یہ ہے کہ طوائفوں کی اکثریت ایسی عورتوں پر مشتمل ہے جنہوں نے اس پیشے کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ انہیں اس میں زیادہ آسانی' زیادہ آزادی اور زیادہ نفع دکھائی دیتا تھا۔''

مذکورہ بالا وجوہات آپس میں اتنی مربوط ہیں کہ انہیں الگ الگ کرنا دشوار ہے۔ ایسی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جو آسانی' رقم اور شہرت کے لیے اپنے جسموں کو فروخت کرنے پر آمادہ ہیں۔ دکانوں پر کام کرنے والی لڑکیوں' ٹائپسٹ' کورس گرلز' فیکٹری ورکروں اور تھوڑی آمدنی والے دوسرے شعبوں میں کام کرنے والی لڑکیاں' جو قبول صورت بھی ہوں' ان مردوں کے ساتھ باہر جانے اور انہیں اپنا جسم سونپنے پر تیار ہوتی ہیں' جو انہیں عیش وعشرت کی اشیاء خرید کر دلوا دیں۔ بعض لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی آزادہ روی کی وجہ سے بدنام ہوتی ہیں اور ان میں سے بہت سی تو طوائفوں سے قریبی مشابہت رکھتی ہیں۔ شاید بیشتر سٹیج کی اداکارائیں یہ یقین رکھتی ہیں کہ ستارہ (یعنی مشہور اداکارہ) بننے کے لیے اپنا جسم کسی کو بھی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

جب پہلا قدم اٹھا لیا جاتا ہے تو باقی راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ لڑکی غیر

پیشہ ور طوائف بن جاتی ہے۔ پھر وہ بتدریج کُل وقتی طوائف بن جاتی ہے۔ اس پیشے میں زندگی مقابلتاً آسان ہوتی ہے اور ابتدائی مرحلے میں تو کافی گلیمر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اعلیٰ طبقے کی طوائفوں کو ایسے مردوں سے واسطہ پڑتا ہے جو کہ بہتر سماجی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

ایسی عورت جو امیر والدین کی بیٹی یا امیر خاوند کی بیوی ہو، وہ طوائف کا پیشہ اختیار کرنے والی لڑکی کے حوالے سے حیرت کا اظہار کرتی ہے۔ اسی طرح قدامت پسند مذہبی لوگ بھی جسم فروشی کو بطور پیشہ اپنانے والی لڑکیوں پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم نہ تو اوّل الذکر اور نہ مؤخرالذکر کو ان وجوہات کا علم ہوتا ہے جو غریب لڑکی کے والدین کو اپنی بیٹی کو جسم فروشی کرتے ہوئے دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ غریب والدین کے ہاں اور پسماندہ ماحول میں جنم لینے والی لڑکیاں افلاس کے جبر سے فرار کے لیے جسم فروشی کی راہ پر چل نکلتی ہیں کیونکہ ان کے سامنے کسی دکان میں سیلز گرل یا فیکٹری ورکر بننے اور کسی عام سی شکل وصورت والے محنت کش سے بیاہے جانے اور گھریلو زندگی کی یکسانیت زدہ فضا میں رہنے کے علاوہ مستقبل کی کوئی امید نہیں ہوتی۔

بڑے شہروں کے غریب علاقوں کے بچوں کے لیے جنسی اعضاء اور حتیٰ کہ جنسی عمل میں بھی کوئی اسرار نہیں ہوتا ہے۔ فحاشی کا تو ذرا بھی سوچا نہیں جاتا۔ ماضی کی طرح موجودہ تہذیب یافتہ دور میں بھی ہر شہر میں آبادی کی کثرت پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اکثر گھرانے ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔ بھائی بہنوں سے جنسی لذت حاصل کرتے ہیں۔ باہمی مشت زنی عام ہوتی ہے۔ ایسے گھرانوں میں محرمات کے ساتھ جنسی تعلقات اکثر و بیشتر ناگزیر ہوتے ہیں۔ لندن میں 1912ء میں شائع ہونے والی کتاب The Prevention of Destitution کا مصنف لکھتا ہے کہ کچی آبادیوں میں ''کسی لڑکی کے بطن سے اس کے باپ کا بچہ پیدا ہونا محض ایک مزاحیہ واقعہ سمجھا جاتا ہے۔'' انگلینڈ کے دیہاتی علاقوں میں صورتحال اس سے کچھ ہی بہتر ہوگی۔ دیہاتی علاقوں کے لڑکے لڑکیاں جانوروں کے جنسی اعضاء سے شناسائی

کے باعث اپنے شہری ہم عمروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس بات پر زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ دیہاتی علاقوں کی لڑکیاں نسبتاً کم عمر میں ہی جنسی عمل کا تجربہ کر چکی ہوتی ہیں اور اکثر و بیشتر طوائف بن جاتی ہیں۔ مزید براں ایسے ماحول میں شادی کو زیادہ قابل تعریف نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے برعکس گھریلو جھگڑوں کے مسلسل نظارے بچوں کو جسم فروشی کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔

غریب علاقوں کی یہ لڑکیاں اپنے سادہ انداز میں اس حقیقت کو پا چکی ہوتی ہیں جسے میرو نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا: ''معاشرے کی حقیقی صورت حالات عورتوں کے ہر اعلیٰ اخلاقی احساس کے خلاف ہوتی ہے کیونکہ اپنے آپ کو جسم فروشی کے لیے وقف کر دینے والی اور شادی کے لیے خود کو بیچ دینے والی عورتوں میں واحد فرق قیمت اور معاہدے کی مدت کا ہوتا ہے۔'' شادی اور طوائفیت (Prostitution) ہر دو صورتوں میں عورت مرد کو اپنا جسم برائے جنسی تسکین پیش کرتی ہے۔ جنس عورت کے سودے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ شادی کی صورت میں عورت زندگی بھر کے لیے سودا کرتی ہے جبکہ طوائفیت کی صورت میں عورت عارضی جنسی تعلق کی قیمت وصول کرتی ہے۔

ایسے حالات بھی ہوتے ہیں کہ جن میں اچھے خاندانوں تک کی لڑکیاں جسم فروشی کا پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں جسم فروشی یا خودکشی یا بھوک سے مر جانے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جو قومیں انقلاب سے دوچار ہوتی ہیں یا جن پر کوئی دوسرا ملک حملہ کر دیتا ہے' ان کی بہت سی پناہ گزین عورتیں بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر جسم فروشی کرنے لگتی ہیں۔ وہ غیروں کے ملک میں ہوتی ہیں' اس ملک کی زبان سے ناواقف ہوتی ہیں اور انہیں کوئی کام کرنا نہیں آتا' نہ وہ کسی کام کے لیے موزوں ہوتی ہیں' چنانچہ وہ مایوسی کے عالم میں اس شے کو بیچتی ہیں جس کی منڈی ہر اس جگہ موجود ہے' جہاں مرد موجود ہے۔

جسم فروشی کو پیشے کے طور پر اپنانے کی وجوہ میں جنس کا کتنا عمل دخل ہوتا ہے' اس کے حوالے سے کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ موراسو کہتا ہے کہ جسم

فروشی کی بڑی وجہ جنسی خواہش ہے اور وہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ طوائفوں کی اکثریت جنسی مریض ہوتی ہے۔ دوسری انتہا پر لومبروسو ہے جو کہتا ہے کہ طوائفیں جنسی اعتبار سے سرد ہوتی ہیں اور میورک لندن کی طوائفوں کے حوالے سے خصوصی طور پر لکھتے ہوئے لومبروسو کے نکتہ نظر کی تائید کرتا ہے۔ مجموعی طور پر محققین کی اکثریت کی رائے یہی ہے کہ جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرنے کا محرک عورتوں کا شدید جنسی جذبہ ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی رائے بھی یہی ہے جس کو تقویت ان مردوں کے بیانات سے ملی ہے جو طوائفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

تاہم شاید چند ایک مثالوں میں طوائفوں میں جنسی جذبے کے بھڑکنے یا جذبات کے اظہار کو غلطی سے حقیقت مان لیا گیا ہے۔ اس امر کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جنس طوائف کا کاروبار ہوتی ہے اور یہ کہ وہ اپنے کاروبار کے تمام حربوں کو استعمال کرنے میں کامل مہارت رکھتی ہے۔ طوائف اپنے گاہک کو مطمئن کرنے کے لیے ایسی شہوت پسندی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کے اظہار میں گھریلو عورتیں شرم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ طوائف کا گاہک چونکہ خود شہوت سے مغلوب ہوتا ہے اس لیے وہ طوائف کے مصنوعی جنسی جذبے کو حقیقی سمجھ لیتا ہے۔

تاہم یہ امر یقینی نہیں ہے کہ جو عورتیں جسم فروشی کے پیشے کا آغاز کرتی ہیں وہ اس وقت پرانی طوائفوں سے زیادہ جنسیت زدہ ہوتی ہیں یا نہیں۔ بہر حال اس حوالے سے کسی قابل قدر ثبوت کا ملنا دشوار ہے۔ خود طوائفوں سے دریافت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح یہ امر بھی یقینی نہیں ہے کہ طوائفیں معاشرے کے دوسرے طبقوں کی عورتوں سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہیں یا نہیں۔ طوائفوں کے ٹھنڈے ہونے کا مفروضہ بوڑھی طوائفوں کو مدنظر رکھ کر قائم کیا گیا ہے اسی لیے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں نوجوان اور کامیاب طوائفوں میں جنسی جذبے کی موجودگی یا عدم موجودگی کا سوال ہے تو اس میں شک شبہے کی گنجائش ہے وہاں بوڑھی اور ناکام طوائفوں کے معاملے میں شبہے کی گنجائش تھوڑی ہے۔ ہر بوڑھی طوائف جنسی اعتبار سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ وہ جتنا زیادہ جسم فروشی کرتی ہے اتنا زیادہ جنسی اعتبار سے

ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے۔ اس امر کے وافر ثبوت ملتے ہیں کہ دنیا بھر کی طوائفوں میں چپٹی لگانے اور ہم جنس پرستی کا رجحان عام ہوتا ہے۔ جو عورت نارمل جنسی عمل سے لذت حاصل کرلیتی ہے، وہ کبھی کبھار ہی چپٹی لگاتی ہے اور ایسی عورت ہم جنس پرست تو شاذونادر ہی ہوتی ہے۔ جس عورت کو مرد کے ساتھ جنسی عمل کے دوران لذت حاصل نہیں ہوتی، وہ ایک طرف تو چپٹی کی طرف مائل ہوجاتی ہے اور دوسری طرف اس میں ہم جنس پرستانہ رجحانات پرورش پانے لگتے ہیں۔ یہ دلیل کہ وہ طوائف بننے سے پہلے سے ہم جنس پرہت تھی، زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ کوئی ہم جنس پرست عورت طوائف کا پیشہ شاذونادر ہی اپناتی ہے۔ تاہم اس کے برعکس جسم فروشی عورتوں میں ہم جنس پرستی اور دیگر کجرویوں کے فروغ پانے کا باعث ہوتی ہے۔ اس حوالے سے مول (Moll) کی یہ تحقیق اہم ہے کہ برلن کی طوائفوں میں ہم جنس پرستی عام ہے اور 25 فیصد طوائفیں اس فعل کی نشئی (Addicted) ہیں۔

اگر عورتوں میں جنس زدگی عام ہوتی تو یہ جسم فروشی کی ایک خاص الخاص وجہ ہوسکتی تھی، تاہم موجودہ دور میں عورتوں کی جنس زدگی، پہلے ادوار کی نسبت زیادہ ہونے کے باوجود، جسم فروشی کو پیشے کے طور پر اپنانے میں بہت کم کردار ادا کرتی ہے۔ البتہ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب عورتوں کی جنس زدگی نے انہیں طوائف بننے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ قدیم روم کے شرفاء کی عورتیں اپنی شدید جنسی کواہش کی تسکین کے لیے باقاعدہ طوائف کی حیثیت سے اپنے آپ کو رجسٹر کروالیتی تھیں۔ بعض عورتوں نے اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے غلام رکھے ہوئے تھے۔ موجودہ دور کی جنسی مریض عورتوں کو آزادیٔ نسواں کی وجہ سے اپنی جنسی بھوک مٹانے کے ایسے ذرائع میسر ہیں کہ جو پہلے ادوار کی ایسی عورتوں کو حاصل نہیں رہے۔ موجودہ دور کی نوجوان لڑکی کی صورت حال 1914ء کی نگرانی میں رہنے والی دوشیزہ سے بالکل مختلف ہے۔ آج کے دور کی لڑکی مختلف نوجوان لڑکوں کے ساتھ کاروں میں گھومتی ہے، ویک اینڈز (Week Ends) اور چھٹیوں کے دوسرے دنوں میں یہاں وہاں سیریں کرتی پھرتی ہے اور رنگ رلیاں مناتی ہے اور اس کے والدین اور معاشرہ اس پر معترض نہیں ہوتے۔

آج کل انگلینڈ میں والدین اپنی بیٹیوں کو گھر چھوڑ کر تنہا رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ اس آزادی کے نتیجے میں بہت سی لڑکیاں جزوقتی' یا کُل وقتی طور پر جسم فروشی کا پیشہ اپنا لیتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ لڑکی جس عمارت میں کمرہ لے کر رہنے لگتی ہے' اسی عمارت میں کوئی غیر پیشہ ور طوائف بھی مقیم ہوتی ہے یا اتفاق ایسا ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی کمرے میں رہنے لگتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اول الذکر لڑکی جسم فروشی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ یوں جہاں ایک طوائف تھی وہاں تھوڑے ہی عرصے میں دوسری طوائف بھی جنم لے لیتی ہے۔

اپارٹمنٹ یا کمرے میں حصہ داری (Sharing) بلاشبہ خطرات سے خالی نہیں ہے۔ جسم فروشی کے حوالے سے تحقیق و تجزیے میں اس امر کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکیلی لڑکیوں کا اکٹھے رہنا' جبکہ ان میں سے ایک اتفاقاً جسم فروش ہو' دوسری لڑکیوں میں طوائف بننے یا ہم جنس پرستی کے رجحان اور دوسری جنسی کجرویوں کے جنم لینے کا باعث بنتا ہے۔ انگلینڈ یا کسی دوسرے ملک میں موجود ہم جنس پرست عورتوں کی تعداد شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم جنس پرست عورتیں زیادہ تر بوس و کنار تک محدود رہتی ہیں تاہم دنیا کے تہذیب یافتہ اور غیر تہذیب یافتہ معاشروں میں ہم جنس پرست عورتیں مختلف قسم کے تیکنیکی آلات مثلاً گوڈیمچی (Godemiche)' ڈلڈو (Dildo)' کنسولیٹر (Consolateur)' بیجوانڈسکریٹ (Bijou Indiscret)' بابو (Baubo) اور پینس سکسیڈینس (Penis Succedaneus) استعمال کرتی ہیں۔ بائبل اور ارسٹوفینیز کی کتاب Lysistrata میں بھی ایسی اشیاء کے استعمال کا ذکر موجود ہے۔

پانچواں باب

مرد طوائف پرست کیوں بنتا ہے؟

طوائفوں کے ساتھ جنسی عمل کر کے اپنی جنسی بھوک کو تسکین دینے والے مردوں میں شادی شدہ، غیر شادی شدہ، نوجوان اور بوڑھے سبھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بات تقریباً حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مرد صرف اس صورت میں طوائفوں کے پاس جاتے ہیں جب انہیں اس کی شدید ترین ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مرد صرف اس وقت طوائف کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے، جب اس کی خواہشات کو پوری کرنے والی یا اس کے لیے آمادہ کوئی عورت دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ نظر انداز کردیئے جانے کے قابل استثنا کے علاوہ اکثر مردوں کو طوائفوں کے ساتھ جنسی عمل کرنے کے تمام تر نقصانات کا پوری طرح علم ہوتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ دس میں سے نو مرد ایسے ہوتے ہیں جو کہ جنسی بیماریوں سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر مرد طوائفوں پر رقم خرچ کرنا فضول خرچی سمجھتے ہیں اور وہ کبھی کبھار ہی اس فضول خرچی کو مناسب تصور کرتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ بہت سے مردوں کو طوائف کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اپنے آپ سے ایک خاص طرح کی کراہت محسوس ہونے لگتی ہے اور انہیں یہ بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی اس بے راہروی کا چرچا نہ ہو جائے۔ عمومی طور پر ان سب اسباب اور خصوصی طور پر بعض دیگر وجوہات کے تحت طوائف کو جنسی لذت کے حصول کا آخری وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں عورتوں کی جسم فروشی کی بنیادی وجہ یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ مرد کو تقریباً آفاقی طور پر اور باقاعدگی سے جنسی لذت کے حصول کی ضرورت ویسے ہی محسوس ہوتی ہے جس طرح کہ خوراک کی ضرورت یا زندگی کی دوسری ضرورتیں محسوس ہوتی ہیں۔ جدید اخلاق پرست اور محققین مرد میں جنسی عمل کی باقاعدہ بھوک کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں اگر مرد کی شادی کم عمری میں کردی جائے تو جسم فروشی کی ہلاکت انگیزی کو محدود کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر مرد کو اپنی جنسی بھوک مٹانے کے محفوظ' قانونی اور سستے وسائل مہیا کردیئے جائیں یعنی ان کو شادی کی سہولت مہیا کردی جائے تو اسے طوائف پرستی سے باز رکھا جاسکتا ہے۔

شادی اور جسم فروشی میں براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ ہر وہ نظام جس میں ایک شادی پر زور دیا جاتا ہے' جسم فروشی اور زناکاری کو فروغ دیتا ہے۔ عیسائی مذہبی پیشواؤں اور اخلاق پرستوں نے انہی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے جسم فروشی کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ قدیم لوگوں اور اولین عیسائیوں کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہے۔ اسی لیے سینٹ آگسٹین' کیٹو (Cato) اور ایکویناس (Aquinas) نے اس کے جواز پیش کیے تھے' جن کا حوالہ ہم گزشتہ صفحات میں دے چکے ہیں۔ تھوڑا عرصہ پہلے لیگوری (Liguori) اور دیگر مصنفوں نے بھی ان سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا ہے جبکہ فلسفیوں اور مفکروں نے بھی ایسے ہی نظریات پیش کیے ہیں۔ ان نظریات و آراء و خیالات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جنسی عمل مرد کی صحت مندی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ جسم فروشی کی تائید کے لیے یہ حیاتیاتی جواز ہے۔

مذکورہ دلائل جنس اور اس کے مسائل کے بارے میں ناکافی علم کی وجہ سے دیئے جاتے ہیں۔ ان دلائل کا کھوکھلا پن اس سادہ سی حقیقت سے عیاں ہے کہ کنوارے مردوں کے ساتھ ساتھ شادی شدہ مرد بھی طوائف پرست ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طوائف کے گاہکوں کی اکثریت نہیں تو بہت زیادہ تعداد شادی شدہ

لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

مرد جن وجوہات کے تحت طوائف کو ترجیح دیتے ہیں یا اپنی بیوی کے علاوہ طوائف سے بھی جنسی تعلق رکھتے ہیں' ان کی تعداد کافی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مردوں کی اکثریت جنس کے اسرار سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتی۔ ان میں کنواروں کے علاوہ ایسے شادی شدہ مرد بھی شامل ہیں جن کی شدید جنسی بھوک کی تسکین شریف گھرانے کی کسی لڑکی کے ساتھ جنسی عمل کرنے سے نہیں ہوسکتی۔ اس حقیقت کو بنجمن فرینکلن نے مزاحیہ انداز میں یوں بیان کیا تھا کہ تمام عورتیں اندھیرے میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مشہور امریکی مصنف' سیاست دان اور موجد بنجمن فرینکلن A Letter To A Young Man On The Choice Of A Mistress میں لکھتا ہے:

''میرے پیارے دوست! تم نے جن شدید فطری میلانات کا ذکر کیا ہے' ان کو مٹانے کی کسی دوا کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر مجھے علم ہو بھی تو مجھے تمہیں اس سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے۔ شادی ایک موزوں علاج ہے۔ یہ انسان کی سب سے زیادہ فطری حالت ہوتی ہے اور اس حالت میں تم حقیقی خوشی پاسکتے ہو۔ تم نے شادی نہ کرنے کی جو وجوہات بیان کی ہیں میں ان سے بالکل متفق نہیں ہوں۔''

شادی کی خوبیوں کے حوالے سے مختصراً لکھنے کے بعد بنجمن فرینکلن لکھتا ہے:

''تاہم اگر اس سب کے باوجود تم شادی پر رضامند نہیں ہو اور طوائفوں کے ساتھ جنسی عمل کرنے کو ناگزیر سمجھتے ہو تو میری نصیحت ہے کہ نوجوان طوائف پر بوڑھی طوائف کو ترجیح دیا کرو۔''

اس کے بعد وہ اس نصیحت کی بہت سی وجوہات بیان کرتا ہے۔ ان میں یہ وجوہات شامل ہیں: دنیا کا زیادہ علم عمر بڑھنے سے حاصل ہوتا ہے' ''جب عورت خوب

صورت نہیں رہتی تو وہ اچھا بننے کی کوشش کرتی ہے''، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ عورتیں زیادہ مہربان ہونے لگتی ہیں' وہ تمہاری بیماری کی حالت میں تمہارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتی ہیں' حاملہ ہونے کا ڈر نہیں رہتا اور وہ ''سازش کرنے'' کے حوالے سے بہت محتاط ہوجاتی ہیں۔ عمر رسیدہ عورت سے مخصوص فوائد کی فہرست یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ فرینکلن مزید لکھتا ہے:

''چونکہ ہر اوپر کو فروغ پانے والے حیوان کے پٹھوں کو بھرنے والے مادوں میں سب سے اوپر والے حصوں میں پہلے کمی ہوتی ہے۔ چہرے پر جھریاں پہلے نمودار ہوتی ہیں' پھر گردن پر' پھر چھاتیوں اور بازوؤں پر...... ازار بند سے نیچے والا حصہ محفوظ رہتا ہے۔ دو عورتوں کو نچلے حصے سے دیکھ کر یہ بتانا ناممکن ہوتا ہے کہ کونسی بوڑھی ہے اور کونسی نوجوان۔ نیز جس طرح تمام بلیاں اندھیرے میں کالی ہوتی ہیں اسی طرح بوڑھی عورت سے جسمانی لذت حاصل کرنا نوجوان عورت سے جسمانی لذت حاصل کرنے کے مساوی ہوتا ہے۔''

اس نے مزید وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بوڑھی عورت کے ساتھ جنسی عمل سے ''تھوڑا گناہ'' ہوتا ہے اور ''ندامت'' کم ہوتی ہے۔ شاید سینٹ پال کے مقولے کو تسلیم کرتے ہوئے بنجمن فرینکلن آخر میں لکھتا ہے: ''تاہم میں تمہیں اب بھی یہی نصیحت کرتا ہوں کہ شادی کرلو۔''

تاہم دوسرے تمام ایسے مفروضوں کی طرح یہ مفروضہ بھی غلط ہے مرد کو جنسی تسکین فراہم کے حوالے سے تمام عورتیں یکساں اہلیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس غلط فہمی کا شکار لوگ جنسی عمل پر اثر انداز ہونے والے نفسیاتی عوامل سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں جنسی عمل کی مختلف تیکنیکوں اور ان کے اثرات کا بھی کچھ علم نہیں ہوتا۔ جب جنسی عمل کا مقصد صرف جسمانی لذت کا حصول ہو تو یہ مشت زنی سے زیادہ بہتر معاملہ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں عورت کی شخصیت اور وضع قطع کو قطعاً

اہمیت نہیں دی جاتی اور مرد عورت کے حسن و جمال اور انفرادیت سے تغافل برتتا ہے۔ شادی کے حوالے سے اس کا رویہ سراسر غلط ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک شادی کا مقصد بے روک ٹوک جنسی عمل کرنے کی سہولت مہیا کرنے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔

تاہم ہر کلچر کے بیشتر مرد محسوس کرتے ہیں کہ عورت کا حسن و جمال اور شخصیت جنسی عمل سے حاصل ہونے والی لذت کو بڑھانے میں برابر کا کردار ادا کرتے ہیں۔ حقیقت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ لاتعداد عورتیں ازدواجی زندگی کے جنسی پہلو سے لاپروائی برتتی ہیں' بعض عورتیں تو اس سے کراہت محسوس کرتی ہیں۔ مرد کو اس حقیقت سے اس وقت تک آگاہی نہیں ہوتی جب تک وہ شادی نہیں کر لیتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شادی کے بعد مرد پر بہت سے پریشان کن اور مایوس کر دینے والے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مرد نازک احساسات کے حامل یا حساس ہوتے ہیں وہ فرسٹریشن کے بڑھنے سے خود بھی لاپروائی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بیوی کے لیے ان کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔

اس امر کی بے شمار مثالیں دستیاب ہیں کہ جن مردوں کی بیویاں ان میں جنسی جذبہ بھڑکانے میں بالکل ناکام رہتی ہیں' طوائفیں ایسے مردوں میں جنسی جذبات انگیخت کرنے میں سو فیصد کامیاب رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اجنبی عورتیں مردوں کے لیے شہوت انگیز ہوتی ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ طوائف جنسی جذبات بھڑکانے کے فن کی ماہر ہوتی ہے۔ اس کا لباس' اس کے انداز و اطوار' اس کی گفتگو — سب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ مرد میں ویسے ہی جنسی جذبات بھڑکانے پر قادر ہوتی ہے جن سے وہ صرف ہنی مون کے چند ہفتوں میں دوچار ہوا ہوتا ہے اور بعد ازاں اپنی بیوی کی صحبت میں شاذ و نادر ہی ایسی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہے۔

لاتعداد مرد اپنی بیویوں کا بھرپور احترام کرنے کے باوجود ان کی موجودگی سے جنسی اعتبار سے انگیخت نہیں ہوتے اور ان میں اپنی بیویوں کے ساتھ جنسی عمل کرنے کی شدید خواہش شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے۔ تاہم دوسری عورتوں کی صحبت

میں یہی مرد ایسی جنسی بھوک کا شکار ہوتے ہیں جو کہ ان کی برداشت سے تقریباً باہر ہوتی ہے۔ ایسے مرد جو خوبصورت اور مہذب عورتوں کے شوہر ہوتے ہیں اور اس کے باوجود طوائف پرست ہوتے ہیں' اپنے دوستوں کے لیے ایک معمہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دوست جنسی نفسیات کی باریکیوں اور مسائل سے آگاہی نہیں رکھتے۔

یہاں ہم اس بات پر دوبارہ توجہ دلانے چاہتے ہیں کہ خوبصورتی کا جنسی بھوک بڑھانے میں بہت بڑا کردار نہیں ہوتا ہے۔ خوبصورت ترین فلمی اداکاراؤں جیسے حسن و جمال کی مرقع عورتیں جنسی جذبے کو انگیخت کرنے کے معاملے میں ہیجڑوں سے زیادہ اہل نہیں ہوتیں۔ عموماً مردوں کو شادی کے بعد اس حقیقت کا پتا چلتا ہے۔

بوڑھے مرد طوائفوں کے پکے گاہک ہوتے ہیں۔ بوڑھے مردوں کا جنسی جذبہ نارمل طریقے سے انگیخت نہیں ہوتا اور وہ اس کے لیے ابنارمل طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود ہوس پرست بوڑھے نوجوان اور خوبصورت طوائفوں کے گاہک بنتے ہیں۔ ان کی بیویوں میں ان کے لیے جنسی اعتبار سے معمولی سی بھی کشش نہیں رہ گئی ہوتی۔ ایک اور مغالطہ بھی عام ہے کہ نوجوان' بالخصوص کنواری لڑکی' بوڑھے مرد کا شباب بحال کر دینے کی اہل ہوتی ہے۔ اس مغالطے کی بنیاد یہ خیال ہے کہ جنسی عمل کے دوران مرد بعض حیات بخش سیال جذب کرتا ہے۔ بائبل میں بھی اس کی ایک مثال ملتی ہے۔

طوائفوں کے پکے گاہکوں میں بوڑھے اور نوجوان' شادی شدہ اور کنوارے جنسی کجرو بھی شامل ہوتے ہیں۔ ایسے کجرو مردوں کی تعداد عمومی اندازے سے بہت زیادہ ہے۔ طوائفوں کے کجرو گاہکوں میں ایسے مرد بھی شامل ہوتے ہیں جو صرف مخصوص حالات یا خاص ماحول میں ہی جنسی عمل کر سکتے ہیں۔ گزشتہ ادوار میں پیرس اور یورپ کے دوسرے شہروں کے چکلوں میں ایسے مردوں کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ تارنووسکی (Tarnowsky) نے ٹاکسل (Taxil) کی کتاب La Prostitution Contemporaine سے ایک حوالہ دیا ہے کہ پیرس کے ایک چکلے میں ایک ایسا کمرا تھا'

جس کو چاندی کی کشیدہ کاری والے سیاہ ساٹن کے پردوں سے ڈھانپا گیا تھا۔ طوائف چہرے اور ہاتھوں پیروں پر سفید رنگ مل کر بستر پر بے حس وحرکت لیٹ جاتی ہے اور مردہ عورت کے ساتھ جنسی عمل سے لذت کرنے والا کوئی کجرو مرد اس سے مجامعت کرتا تھا۔ اس طرح کی جنسی کجرویوں میں مبتلا امیر مردوں کی تسکین کے لیے مہنگے چکلوں میں خصوصی انتظامات کیے گئے ہوتے تھے۔

ایسے مرد جو عمر بڑھنے یا کسی دوسری وجہ سے نامرد ہو جاتے ہیں؛ انہیں چکلوں میں مصنوعی جنسی آلات کے ذریعے اپنی شہوت کی تسکین کے مواقع ملتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ ایسے آلات کے استعمال سے ان کی بیویاں شرم یا کراہت محسوس کرتیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت کم مرد ایسے ہوتے ہیں جو کسی معزز عورت کے ساتھ ایسے ذرائع استعمال کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ طوائفیں نامردوں کو جنسی طاقت دینے والی ادویات فراہم کرتی اور دوسرے طریقوں سے آگاہ بھی کرتی ہیں۔ ایستادگی کے وقت کو بڑھانے کے لیے طوائفیں مردوں کے عضوتناسل پر سونے، چاندی یا ربر کے چھلے چڑھا دیتی ہیں؛ جو عضو کے آخری حصے کو مضبوطی سے گرفت کر لیتے ہیں۔ چکلوں میں اس کے علاوہ بھی بہت سے آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔

کمروں یا چھوٹے فلیٹوں میں تنہا رہنے والی طوائفیں اپنے گاہکوں کو وہ ''سہولیات'' فراہم نہیں کر سکتیں جو کہ انہیں چکلوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ تاہم لندن میں تنہا رہنے والی طوائفوں کے پاس کوڑے اور ایذا دہی کے بعض دوسرے آلات موجود ہوتے ہیں؛ جن کے ذریعے مساکیت پسند (Masochists) اور کبھی کبھار سادیت پسند (Sadists) تسکین حاصل کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ

جسم فروشی کی تاریخ

چھٹا باب

قدیم زمانے میں جسم فروشی

موجودہ زمانے میں قانونی مفہوم میں جسم فروشی تہذیب کا ایک رِستا ہوا زخم ہے۔ زیادہ سخت الفاظ میں بات کی جائے تو ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وحشی اور غیر مہذب اقوام میں سو ہو اور باویری جیسے علاقوں کی پیشہ ور طوائفوں جیسی عورتیں بالکل وجود نہیں رکھتی تھیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحشی اور غیر مہذب اقوام ہم سے زیادہ باعصمت تھیں اور ان کے مرد وخواتین سے زیادہ اخلاق پسند تھے۔ بشریات کے علماء اور مصنفین نے اس معاملے پر اکثر روشنی ڈالی ہے۔ جسم فروشی کی عدم موجودگی کو ناجائز جنسی عمل کی عدم موجودگی کی شہادت سمجھا جاتا ہے نیز وحشی اور غیر مہذب اقوام کے باعصمت ہونے کا ثبوت مانا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے۔

لوگ جسم فروشی کی عدم موجودگی کو عصمت کی موجودگی سے اس لیے مربوط سمجھتے ہیں کہ وہ اس حقیقت سے لاعلم ہوتے ہیں کہ بیشتر غیر مہذب اقوام میں ایسی جنسی بے راہروی موجود ہوتی ہے جو کہ جسم فروشی کی قانونی تعریف کے علاوہ اس سے قطعاً مختلف نہیں ہوتی۔ جس ملک کی پوری نسوانی آبادی اس کام کے لیے مہیا ہو جو دوسرے ملک کی طوائفیں کرتی ہیں تو ایسے ملک میں پیشہ ورانہ جسم فروشی نہ ہوتی ہے نہ ہوسکتی ہے۔

اس بات کو وضاحت سے سمجھنے کے لیے ذہن میں دو نکات کا ہونا بہت ضروری ہے:

(1) کنوار پن کا بے پناہ احترام اور عورت کا اپنے کنوار پن کو محفوظ رکھنے کا حق۔(2)شادی کی روایت کا کسی نہ کسی صورت میں موجود ہونا۔

بہت سے غیر مہذب اور وحشی قبیلوں میں کنوار پن کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے اور بعض قبیلے تو اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو بلوغت کے بعد لڑکی میں کنوار پن کی موجودگی کو ایک طرح کی معذوری سمجھا جاتا ہے۔ مارکو پولو (Marco Polo) نے لکھا ہے کہ تبت میں کوئی مرد ''کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرتا جو کہ کنواری ہو'' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ ''جو عورت مردوں کی صحبت سے دور رہی ہو وہ بیوی بننے کے قابل نہیں ہوتی۔'' ویسٹر مارک (Wester Marck) کے بقول مشرقی افریقہ کے اکمبا قبیلے میں ایک حاملہ لڑکی کو شادی کے لیے ''موزوں ترین لڑکی'' مانا جاتا ہے جبکہ بالائی مونگولا کے مونگواڈی اور فرنچ گیانا کے باگا لوگ ایسی لڑکیوں سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جو پہلے ہی بچوں کو جنم دے چکی ہوں۔ (دی ہسٹری آف ہیومن میرج' ازایڈور ڈویسٹر مارک' پانچواں ایڈیشن جلد اول)۔ دنیا کے مختلف حصوں کی بہت سی وحشی اور غیر مہذب اقوام میں ایسی عورت کو شادی کرنے میں سہولت رہتی ہے جس کے بہت سارے مردوں کے ساتھ معاشقے رہے ہوں۔ ایسی عورت سے شادی کرنے والا مرد اُسے ایک ایسی پرکشش عورت سمجھتا ہے' جسے پانے کی بہت سے مردوں کو خواہش رہی ہوتی ہے۔

پرانے زمانے میں شادی شدہ عورت پورے قبیلے کی بیوی ہوتی تھی۔ قدیم لوگ کسی عورت سے اس مقصد کے تحت شادی رچاتے تھے کہ وہ پورے قبیلے کے مردوں کی مشترکہ ملکیت ہوگی اور سب مرد اس کے ساتھ جنسی عمل کریں گے۔ موجودہ دور میں جس چیز کو جسم فروشی کہا جاتا ہے' قدیم زمانے کی اجتماعی شادی اس سے مختلف نہیں ہوتی تھی۔ تھیوپومپس (Theopompus) کے بقول ''ٹرہانیوں میں قانون ہے کہ عورت مشترکہ ہوگی۔'' ایک زوجگی کے مروج ہونے کا لازمی نتیجہ جسم فروشی ہے۔ مرد کی کثیر زوجی فطرت اور عورتوں کی فراوانی جسم فروشی کے فروغ کا سبب ہے۔

شمالی امریکہ کے کچھ خاص قبیلوں میں شادی (اگر اسے شادی کہا جا سکے تو) ناجائز جنسی مراسم سے تھوڑی سی ہی مختلف ہوتی تھی۔ جب کوئی کنواری لڑکی یہ دیکھتی کہ اس کی شادی کا امکان موہوم ہے تو وہ کسی تقریب میں قبیلے کے مردوں کو خود دعوت دیتی کہ وہ اس کے ساتھ باری باری جنسی عمل کریں۔ اس عمل کی وجہ سے اس سے شادی کا ارادہ رکھنے والوں میں کمی کی بجائے ہوتا یہ تھا کہ کوئی نہ کوئی مرد اس سے شادی کی درخواست کر دیتا۔

افریقہ کے بعض حصوں، بالخصوص داہومی میں یہ روایت ہے کہ بادشاہ ہر عورت کے ساتھ جنسی عمل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ طوائفیت ہی کی ایک صورت ہے۔ ان علاقوں میں قبائلی سردار، حکیم اور دوسرے اعلیٰ حیثیت والے مرد جتنی شادیاں چاہیں کر سکتے ہیں اور کنیزیں رکھ سکتے ہیں۔ عورتوں کو خریدا اور کسی بھی وقت چھوڑا جا سکتا ہے اور ایسی عورتوں کی اکثریت، موجودہ مفہوم میں طوائف بن کر ہر مرد کو اپنا جسم جنسی عمل کے لیے سونپ دیا کرتی ہے۔

بہت سی غیر مہذب اور نیم مہذب اقوام میں ناجائز جنسی مراسم باقاعدہ طوائفیت میں ڈھل جاتے ہیں، جس کی وجہ سے تاجروں اور جہاز رانوں نیز حد تو یہ ہے کہ مشنریوں کا مقامی لوگوں میں گھلنا ملنا ہے۔ دنیا کے دور دراز علاقوں میں سفر کرنے والے لوگوں اور دریافت کنندگان نے لکھا ہے کہ ایسے علاقوں میں یورپی تاجر، جہاز راں اور مشنری مقامی عورتوں کو پیسے ادا کر کے انہیں اپنی ''عارضی بیویاں'' بنا لیتے ہیں۔ ایسی عورتوں کے والدین یا شوہر غیر ملکی لوگوں کے ساتھ ان کے اس طرح کے ناجائز مراسم پر توہین محسوس نہیں کرتے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بہت سی غیر مہذب اور نیم مہذب اقوام میں پیشہ ورانہ جسم فروشی اور چکلے وجود پذیر ہوئے تھے۔

مے ہیو (Mayhew) اور ہیمنگ (Hemyng) اپنی کتاب London Labour And London Poor میں جسم فروشی کے بارے میں لکھتے ہوئے جرنگھم ویکفیلڈ (Jerningham Wakefield) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ نیوزی لینڈ کی بندرگاہوں پر بحری جہاز رانوں کی آمد و رفت سے ماؤری قبیلے میں جسم فروشی رائج ہو گئی۔ وہ بتاتا

ہے کہ اس قبیلے میں ''عارضی بیویوں'' کی رسم شروع ہوگئی۔ کچھ جہاز رانوں کے ساتھ مستقل طور پر عورتیں رہتی تھیں لیکن باقی مجبور تھے کہ وہ عورتوں کو کرائے پر حاصل کریں۔ رسمی طور پر سودے بازی ہوتی تھی اور جب کوئی عورت جنسی تسکین دینے سے قاصر ہوتی ہے تو اس کی جگہ دوسری عورت کو حاصل کر لیا جاتا تھا۔'' یہی مصنف لکھتے ہیں کہ ''ہم نے 1846ء کے ویلنگٹن کے جرائم کے کیلنڈر میں ایک مقامی شخص کو چکلا چلانے کے الزام میں سزا دیے جانے کا پڑھا۔''

جب رقم یا اس کے مساوی کوئی شے داخل ہوتی ہے تو جسم فروشی فروغ پانے لگتی ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں اور تمام اقوام میں ایسے والدین پائے جاتے ہیں جو رقم کے بدلے اپنی بیٹیوں کو طوائف بنانے پر تیار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی پائی جاتی ہیں جو بالغ ہونے کے بعد تحائف یا نقدی کے بدلے اپنا کنوار پن کھونے کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ ویسٹر مارک نے پورٹر (Porter) کے حوالے سے لکھا ہے کہ میڈیسن جزائر کی لڑکیاں ''ان سب مردوں کی بیویاں ہوتی ہیں جو ان کا جسم خرید سکتے ہوں۔ ایک خوبصورت بیٹی کو اس کے والدین ایک ایسی نعمت سمجھتے ہیں جو انہیں دولت اور خوشحالی عطا کر سکتی ہے۔''

اسی طرح ''لائن جزائر کی عورتوں کو جتنے مرد چاہیں معاوضہ ادا کر کے جنسی عمل کے لیے لے جا سکتے ہیں۔'' ویسٹر مارک ہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں کے لوگ رقم ادھار لے کر اپنی بیٹیوں یا بیویوں کو رہن رکھوا دیتے تھے۔ یہی روایت آگے چل کر باقاعدہ جسم فروشی میں بدل گئی بالخصوص میلانیشین جزائر، کیرولین جزائر، یوگنڈا، گرین لینڈ اور شمالی، وسطی اور جنوبی امریکہ کے لاتعداد انڈین قبیلوں میں۔

بہت سی لڑکیاں اپنی مرضی سے یا اپنے والدین کی ہدایت پر اپنا جہیز اکٹھا کرنے کے لیے عارضی طور پر طوائف بن جاتی تھیں۔ برینٹم (Brentome) لکھتا ہے کہ قبرص کی عورتوں میں پرانے زمانے میں یہ رسم عام تھی۔ وہ ساحل پر چلی جاتیں اور جہاز رانوں کو اپنا جسم بیچ کر رقم کماتی تھیں۔ نکاراگوا میں بھی یہ روایت موجود رہی ہے۔

بعض قبیلوں میں یہ روایت بھی موجود رہی ہے کہ لوگ اپنی بیویاں یا بیٹیاں معاوضہ لے کر اجنبی لوگوں کو جنسی عمل کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ بعض قبیلوں میں یہ روایت مذہبی رسومات کا نمایاں حصہ رہی ہے۔ پرکس (Purchas) کے بقول کائنڈو میں (یہ تبت سے ملحقہ علاقے کا قدیم نام ہے) روایت تھی کہ لوگ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے وہاں سے گزرنے والے اجنبی مسافروں کو اپنی بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں پیش کر دیا کرتے تھے۔ پیٹا گونیا میں ''پروہت کے حکم پر عمل کرتے ہوئے کوئی مرد اپنی بیوی کو جنگل یا کسی بھی متعینہ مقام پر بھیج دیتا تھا اور وہاں جو شخص اسے پہلی بار ملتا، اس عورت کے ساتھ جنسی عمل کرنے کا استحقاق رکھتا تھا جبکہ اس عورت کو وہاں بھیجنے والا اس کا خاوند اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔'' میلینوسکی (Malinowski) اپنی یادگار کتاب The Sexual Life Of Savages In North-Western Melanesia میں لکھتا ہے کہ سناکاڈی نامی ایک سردار سفید فام لوگوں کی جنسی تسکین کے لیے اپنی بیویاں پیش کرتا تھا اور اس کتاب کی اشاعت کے وقت (1929ء) میں اس کا نوجوان بیٹا اپنے باپ کی روایت پر عمل پیرا تھا۔ میلینوسکی کہتا ہے: ''ایک سفید فام تاجر نے مجھے بتایا کہ ایک مقامی باشندہ اس کے لیے نوجوان لڑکیاں مہیا کرتا تھا۔ ایک بار کوئی لڑکی نہ ملی تو اس نے اپنی نوجوان بیوی کو پیش کر دیا اور خود دہلیز پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔''

بہت سے غیر مہذب اور نیم مہذب قبیلوں میں یہ روایت رہی ہے، نیز بعض صورتوں میں اب بھی موجود ہے، کہ جنسی تسکین کے لیے مردوں اور عورتوں کو مخصوص کر دیا جاتا ہے۔

ان کو جسم فروش/طوائف نہ کہے جانے سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوتی کہ ان میں اور جنوبی امریکہ کے بدنام ترین چکلوں میں بیٹھنے والی عورتوں میں سوائے نام کے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ پولینیشیا کے ٹنی جزائر کے لوگ لڑکیوں کی ایک خاص تعداد کو ہر طرح کی جنسی کجروی کے لیے مخصوص کر رکھتے تھے اور انہیں تربیت بھی دی جاتی تھی۔

تاہم ہیمنڈ (Hammond) نے نیو میکسیکو کے پیوبلو انڈینز کی ایک رسم کا جو حوالہ دیا ہے' وہ شاید ایسی رسموں میں سب سے زیادہ بری ہے۔ ان لوگوں میں روایت ہے کہ ہر بستی میں ایک کم عمر لڑکے کو منتخب کرلیا جاتا ہے' جس کے ساتھ باقی سارے مرد جنسی عمل کرتے ہیں۔ ایسے لڑکے کو مجیراڈو (Mujerado) کہا جاتا تھا' جس کا مطلب تھا: ''عورت میں بدلا گیا۔''

❁ ❁ ❁

ساتواں باب

مذہبی جسم فروشی

جسم فروشی اپنے ابتدائی مرحلے میں مذہب سے منسلک ہوتی تھی اور اس مفروضے کے حق میں مضبوط شواہد دستیاب ہیں کہ اولین چکلے پروہتوں کی نگرانی میں چلتے تھے۔ تاہم انہیں چکلے کہنے کی بجائے مندر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور ان میں بیٹھنے والی عورتوں کو طوائف کی بجائے مندر کی بیٹیاں' وینس کی پجارنیں کہا جاتا تھا یا ایسے ہی دیگر نام استعمال کیے جاتے تھے۔

مذہبی جسم فروشی کے آغاز کے بارے میں بہت تحقیق کی گئی ہے اور اس حوالے سے بہت سے مفروضے قائم کیے گئے ہیں۔ بشریات کے بہت سے اولین عالموں کا خیال تھا کہ یہ زرخیزی مت (Fertility Cult) کا ایک حصہ تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ خاص تقریبات کے دوران مردوں اور عورتوں کے ناجائز جنسی مراسم قائم کرنے کی رسم کے پس پردہ یہ تصور تھا کہ اس طرح جانور اور زمین بارور ہوتے ہیں۔ ایک عورت سے شادی کی روایت کے آغاز اور اس کے نتیجے میں ناجائز جنسی مراسم پر ممانعت کے بعد یہ ضروری ہوگیا تھا کہ زرخیزی مت کے لیے ناگزیر عورتوں کی مخصوص تعداد کو الگ کردیا جائے۔ اپنا کنوارپن اور شادی کا حق قربان کردینے والی عورتوں کو ویسی ہی نظر سے دیکھا جاتا تھا' جیسی نظر سے ہم موجودہ دور میں ننوں اور پادریوں کو دیکھتے ہیں جو کہ خداوند کی خاطر جنسی لذتوں اور نارمل زندگی کی مسرتوں کے اپنے حقوق سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔

اگرچہ زرخیزی مت والا مفروضہ چند ایک مثالوں کے حوالے سے تو بجا طور پر

قابل اعتبار ہے تاہم یہ اتنا محدود ہے کہ اسے مذہبی یا مقدس جسم فروشی کے آغاز کی آفاقی وضاحت کے طور پر قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ خاص طور پر مردانہ جسم فروشی کے آغاز کے حوالے سے اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں مردانہ جسم فروشی اتنی ہی عام تھی جتنی کہ نسائی جسم فروشی اور یہ نسائی جسم فروشی کے مانند مذہب سے ہی منسلک ہوتی تھی۔

اس کے بجائے یہ مؤقف زیادہ جاندار دکھائی دیتا ہے کہ مذہبی جسم فروشی ہر قدیم قوم میں مشترکہ طور پر پائے جانے والے اس عقیدے کا نتیجہ تھی کہ دیوتا یا دیوتا سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ جنسی عمل کرنے والا شخص بے شمار فائدے حاصل کرتا ہے۔ ویسٹر مارک اپنی کتاب The History Of Human Marriage میں لکھتا ہے: ''مراکش میں آج بھی یہ عقیدہ موجود ہے کہ مخالف صنف کے علاوہ اپنی صنف کے فرد کے ساتھ جنسی عمل کرنے سے مافوق الفطرت فوائد حاصل ہوتے ہیں۔'' جن ملکوں میں عورتیں یا مرد عارضی طوائف بن جاتے تھے اور انہیں یا ان کے رشتہ داروں کو اس پر شرم یا ندامت محسوس نہیں ہوتی تھی' ان کے حوالے سے یہ مفروضہ درست معلوم ہوتا ہے۔

ہیروڈوٹس کے بقول بابل کی عورتوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ میلیتا (Mylitta) کے معبد میں بیٹھیں اور جو شخص ان سے جنسی عمل کرنا چاہے' اسے اس کی اجازت دے دیں۔ دوسرے لفظوں میں اس عورت کے لیے عارضی طور پر طوائف بننا لازمی ہوتا تھا جبکہ اس کے ساتھ جنسی عمل کرنے والا مرد اس کا معاوضہ دیوی کی نذر کیے جانے والے چڑھاوے کی صورت میں ادا کرتا تھا۔ ہر عورت کے لیے لازمی ہوتا تھا کہ وہ اس وقت تک معبد میں رہے جب تک کوئی مرد جنسی عمل کے لیے اسے منتخب نہ کرلے۔ بدصورت یا کم خوب صورت عورتوں کو مہینوں اور بعض اوقات برسوں تک وہیں رہنا پڑتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف ہیروڈوٹس نے ہی یہ بات لکھی ہے' اس لیے یہ اس کے تخیل کا کرشمہ ہے' حقیقت کا بیان نہیں ہے۔ تاہم یہ نقاد اس حقیقت کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ معاصر مبصرین کے توثیقی بیانات بھی دستیاب ہیں۔

اپوکریفا (Apo Crypha) کی ایک کتاب Epistle Of Jeremy میں کہا گیا ہے:
''کہا جاتا ہے کہ بابل کی عورتیں بخورات سلگا کر راستوں میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ کوئی راہگیر انہیں لے جانا چاہتا تو انہیں اس کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔''

ہیروڈوٹس نے کورنتھ میں بھی ایک ایسے معبد کی موجودگی کا لکھا ہے۔ جیووینل (Juvenal) بتاتا ہے کہ تمام رومن معبد لائسنس یافتہ چکلے ہوتے تھے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے علاقوں میں یہ روایت موجود تھی کہ عورتوں کو عارضی طوائف کے طور پر معبدوں میں لازماً بیٹھنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ معبدوں میں مستقل طوائفیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایک پرانا مؤرخ سٹریبو (Strabo) کورنتھ میں واقع عریاں ایفروڈائٹ کے معبد کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں ایک سو سے زیادہ پجاری ہوتی تھیں، ان سب پر دیوی کی خدمت کرنا لازم تھا۔ سمنر (Sumner) کہتا ہے کہ ''سیزروں کے زمانے میں تھیبیز کے شرفاء کے خاندانوں کی انتہائی خوبصورت لڑکیوں پر لازم تھا کہ وہ ایمون (Ammon) کے معبد میں پاک ہونے کے عمل سے گزریں۔ ہر ایسی لڑکی کو شاہی کنیز بننے کا شرف حاصل ہوتا تھا اور جب اسے اس منصب سے ہٹا دیا جاتا تو ہمیشہ اس کی شادی شان وشوکت کے ساتھ ہوتی تھی۔''

(W.G.Summer, Folkways, Ginn & Co,Boston, 1907, P.541)

ہندوستان کے مندروں سے وابستہ ناچنے والی لڑکیاں جسم فروش ہوتی تھیں اور آج بھی ہوتی ہیں۔ پروہت اور مندر سے متعلق دوسرے افراد جب چاہیں ان کے ساتھ جنسی عمل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مندروں میں آنے والے عام لوگ بھی معاوضہ ادا کر کے ان کے ساتھ جنسی عمل کرتے تھے۔ ہندوستان میں صدیوں سے یہ رسم بھی موجود چلی آرہی ہے کہ اگر کسی کی پہلی اولاد لڑکی ہوتی تو اسے قبیلے کے دیوتا کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا۔ فرض یہ کیا جاتا تھا کہ اس کی شادی دیوتا سے ہوگئی ہے۔ وہ لڑکی مندر کی طوائف کی حیثیت سے خدمات انجام دیا کرتی تھی۔ یہ دریافت کرنا مشکل ہے کہ یہ اور اس طرح کی دوسری رسمیں موجودہ زمانے میں کس حد تک باقی ہیں۔ برطانوی راج کے دوران مندروں میں ہونے والی جسم فروشی کو ختم کرنے

کی کوششیں کی گئی تھیں تاہم اس ایقان کے لیے کافی دلائل ہیں کہ یہ روایت قدرے جدید صورت میں آج بھی موجود ہے۔

مغربی افریقہ کے کچھ قبیلوں میں مخصوص لڑکیوں کو شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ وہ تہذیب یافتہ ملکوں کی ننوں کی طرح اپنے دیوتا کی خدمت کے لیے وقف ہوتی ہیں اور انہیں پجارنیں کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ اس اوائلی عیسائی روایت سے مشابہہ ہے' جس کے تحت کنواری لڑکیوں کو خداوند اور یسوع کے لیے وقف کردیا جاتا تھا اور اس وقت کے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ لارڈ (Lord) ان ''مقدس'' عورتوں کے ساتھ مجامعت کرتا ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ قبائلی ''مقدس'' عورتیں طوائف ہوتی تھیں جبکہ عیسائی ''مقدس'' عورتیں خداوند اور یسوع کی دلہنیں (Brides Of God And Christ) ہوتی تھیں۔ مذکورہ بالا قبائلی لڑکیاں پجارنیں بھی ہوتی تھیں اور جو شخص معاوضہ ادا کردیتا تھا اس کے لیے دیوتا کے تحفے کا کردار بھی ادا کرتی تھیں۔ ویسٹر مارک کے بقول سلاو ساحلوں پر آباد آئیوی زبان بولنے والے قبیلوں کی دیوتا سے منسوب عورتیں درحقیقت طوائف ہوتی ہیں۔ وہ جو فحش حرکت کریں' انہیں قصوروار نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ دیوتا کے حکم کی تعمیل کر رہی ہیں۔

(Edward Westermarck, The Origin And Development Of The Moral Ideas, Macmillan, 1917.)

اسی طرح گولڈ کوسٹ میں (جواب گھانا کہلاتا ہے) پجارنوں کو شادی کرنے کی ممانعت ہوتی تھی' تاہم وہ جس شخص کے ساتھ چاہتیں جنسی عمل کرسکتی تھیں۔

پرانے زمانے کے لوگوں میں یہ خوف موجود تھا کہ اگر لڑکی شادی کے وقت کنواری ہو تو اسے پہلی مجامعت میں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی خوف کے زیراثر لوگ کنواری لڑکی پروہت یا دیوتا کے نمائندہ کسی مقدس شخص یا کسی اجنبی کو پیش کرتے تھے جو اس سے جنسی عمل کر کے اس کا کنوارپن ختم کرتا تھا۔ قدیم اقوام میں یہ عقیدہ عام تھا اور آج بھی کچھ خاص غیر تہذیب یافتہ قبیلوں میں پایا جاتا ہے۔ دولہا کے جنسی عمل

کے ذریعے دلہن کا کنوار پن ختم کے ساتھ وابستہ خوف تقریباً آفاقی تھا اور اسی خوف کے زیرِ اثر اس عجیب وغریب اور وحشیانہ رسم کا آغاز ہوا تھا جسے Jus Primae Noctis کہا جاتا ہے اور جس کے تحت کسی ریاست کا بادشاہ یا قبیلے کا سردار یا پروہت یا شامان ہر دلہن کا کنوار پن ختم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ جدید دور کے مصنفین اس رسم کو حقارت اور کراہت سے دیکھتے ہیں تاہم پرانے وقتوں میں لوگ خوشی کے ساتھ بادشاہوں کو یہ حق دیتے تھے۔ ممکن ہے پروہتوں نے اپنی نفساتی خواہشات کی تسکین کے لیے اس خوف کو لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کیا ہو۔ دولہا کو پختہ یقین ہوتا تھا کہ اگر اس نے پردۂ بکارت کو پھاڑا تو یقینی طور پر اسے کوئی نقصان پہنچے گا لہٰذا وہ کسی ایسے فرد کو تلاش کرتا' بغیر کسی ندامت اور شرم کے' جو کہ دلہن کا پردۂ بکارت پھاڑنے پر تیار ہو۔ یہ خوف ایسا ہی تھا جیسا کہ آج کے بیشتر لوگ اس امر کو گناہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو حاملہ ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔ بعض اوقات پردۂ بکارت کو مجامعت کے بغیر پھاڑا جاتا تھا تاکہ جنسی عمل سے منسوب مفروضہ نقصان نہ ہو۔ کراما (Krama) کے بقول ساموآ میں دلہا ہاتھ کی پہلی انگلی سے پردۂ بکارت کو پھاڑا کرتا تھا۔ بعض اوقات اس مقصد کے لیے چھڑی استعمال کی جاتی تھی۔ فلپائن میں پردۂ بکارت پھاڑنے کا عمل قبیلے کی کوئی بوڑھی عورت انجام دیتی تھی۔ ہندوستان میں پتھر' ہاتھ دانت یا لکڑی سے بنائے گئے دیوتا کے عضو تناسل سے دلہن کا پردۂ بکارت پھاڑا جاتا تھا۔ بعل کے ماننے والوں میں بھی ایسی ہی روایت موجود تھی' جس کا عہد نامۂ قدیم میں اکثر ذکر ملتا ہے۔ بعل کے مندر چکلے کی پروہت طوائفیں دیوتا کے پتھر کے قضیب سے اپنے پردۂ بکارت کو پھاڑتی تھیں۔

پرانے لوگوں میں پردۂ بکارت پھٹنے سے وابستہ خوف کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے والوں نے یہ مفروضہ قائم کیا ہے کہ چونکہ اس عمل کے نتیجے میں خون بہتا ہے اس لیے لوگوں کے ذہنوں میں خوف سما گیا ہوا تھا۔ ایسا ہی خوف حیض کے خون سے وابستہ تھا۔ پرانے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پہلی مجامعت میں بہنے والا خون' حیض کے خون کی طرح زہریلا اور انسان کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صرف

دیوتاؤں کے قریبی لوگ یعنی پروہت یا قبیلے کے سردار یا بادشاہ کنواری لڑکی کا پردۂ بکارت پھاڑ سکتے تھے۔ بعض لوگ غیر ملکیوں یا دوسرے قبیلوں کے مردوں کو اس خطرے سے محفوظ تصور کرتے تھے اور انہیں اپنی دلہنوں کا پردۂ بکارت پھاڑنے کا موقع دیتے تھے۔ ویسٹر مارک اپنی کتاب History of Human Marriage اور ہارٹ لینڈ اپنی کتاب Ritual and Belief میں بتاتے ہیں کہ بہت سی اقوام میں اجنبیوں کو نیم مافوق الفطرت مخلوق سمجھا جاتا تھا نیز پروہتوں یا مقدس لوگوں کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ دلہن کے ساتھ ان کے جنسی عمل کرنے سے نہ صرف دلہا ہر نقصان سے محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ دلہن کے لیے بھی یہ عمل فائدہ مند ہوتا ہے۔ بعض اوقات اجنبیوں کو اس کام کے بدلے معاوضہ بھی دیا جاتا تھا کیونکہ انہوں نے دلہا کو پہنچنے والے ممکنہ نقصان سے اسے بچا لیا ہوتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دلہا اپنی زندگی کے اس مقام پر ہے کہ جہاں اسے نقصان پہنچنے کا خاص امکان ہے۔

کچھ قبیلوں میں Jus Primae Noctis ایک ایسا موقع بن جاتا ہے' جس کو تہذیب یافتہ اقوام میں محرمات سے مباشرت کہا جاتا ہے۔ ان قبیلوں میں لڑکی کا باپ اس کا پردۂ بکارت پھاڑنے کا حق رکھتا ہے۔ ویسٹر مارک سترہویں صدی کے ایک مصنف ہرفورٹ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سنہالیوں میں یہ روایت موجود ہے کہ لڑکی کا باپ اس کی شادی کی رات اس کا پردۂ بکارت پھاڑتا ہے۔ سنہالی کہتے ہیں کہ باپ ''اپنے اگائے ہوئے پودے کا پہلا پھل کھانے کا حق رکھتا ہے۔'' ملایا کے بعض قبیلوں میں بھی یہی رسم موجود ہے۔

جن علاقوں میں پردۂ بکارت پھاڑنے کا حق مخصوص لوگوں کو نہیں دیا گیا ہوتا' وہاں اسے کھلے عام نیلام کیا جاتا ہے۔ ویسٹر مارک اس حوالے سے لوآنگو کے ساحل پر رہنے والے مفیوٹ قبیلے کی مثال دیتا ہے' جو اپنی لڑکیوں کے بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد انہیں سجا سنوار کر بستی بستی لیے پھرتے ہیں۔ روتھ' سپنسر' گلن اور دیگر مستند مصنفین بتاتے ہیں کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندے بلوغت کی عمر کو پہنچنے والی ہر لڑکی کو جھاڑیوں کے پیچھے لے جا کر اس کی ساتھ زبردستی اجتماعی جنسی عمل کرتے

ہیں۔ یہ ایک قبائلی روایت ہے کہ لڑکی کو کسی ایک مرد کی خصوصی ملکیت بننے سے پہلے متعدد منتخب شدہ مردوں کے ساتھ ناجائز جنسی عمل کرنا پڑتا ہے۔

نیلامی یا Jus Primae Noctis کے تحت لڑکی کے ساتھ کیے جانے والے جنسی عمل اور مذہبی جسم فروشی میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ یہوداہ کے عہدنامے میں ایک عبارت موجود ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ''آموریوں کا قانون تھا کہ جس لڑکی کی شادی ہونے والی ہوتی تھی' اسے دروازے پر سات دن تک ناجائز جنسی عمل کروانے کے لیے بیٹھنا پڑتا تھا۔''

(Testament of The Twelve Patriarchs, Translated by Charles)

یقیناً اسی روایت کے تحت آگے چل کر عورتیں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ خود رکھ کر باقی آمدنی مندر کو دینے لگی ہوں گی۔ ہندوستان میں' دیوتا کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے والی مندروں میں مقیم ناچنے والی لڑکیوں کے علاوہ دیگر طوائفیں بھی ہوتی تھیں' جو اپنی آمدنیوں کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھا کرتی تھیں۔

ایک زمانے میں ننیں کھلم کھلا جسم فروشی کیا کرتی تھیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں تو اس عمل کو خوب فروغ ملا اور قدیم و غیرمہذب اقوام کی مقدس طوائفوں میں اور جسم فروش ننوں میں بہت کم فرق رہ گیا۔ لزبن میں یہ عمل انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ 1769ء میں شائع ہونے والی کتاب

Authentic Memoirs Concerming The Portuguese Inquisition

میں درج ذیل عبارت موجود ہے:

> ''خود بادشاہ (جان پنجم) نے ایک نن کو داشتہ بنایا ہوا تھا اور سارے شہر کے سامنے اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اس نے ننوں کی مخصوص عمارت سے متصل ایک اپارٹمنٹ اپنی داشتہ نن کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ تاہم جب بہت زیادہ بدنامی ہوئی تو اس نے مشہور فرمان بعنوان Contra Freiraticos جاری کیا' جس کے تحت ننوں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنا ممنوع قرار دے دیا

گیا۔"

اسی کتاب میں بتایا گیا کہ لزبن کی طوائفیں اپنے کام میں مصروفیت کے دوران اپنی لمبی مالاؤں پر Ave Marias اور Pater Nosters پڑھتی رہتی تھیں۔ مصنف کہتا ہے: "لہذا میں اپنے علم کے ساتھ بیان کرسکتا ہوں کہ میں نے گلی میں یا کھڑکی میں موجود کسی طوائف کو کبھی مالا اور صلیب کے بغیر نہیں دیکھا جبکہ وہ زیرِلب عبادت کرتی رہتی تھی۔" موجودہ دور میں بھی کیتھولک ملکوں میں طوائفیں جس بستر پر اپنا کام کرتی ہیں، اس کے ساتھ والی دیوار پر صلیب آویزاں کیے رکھتی ہیں۔

مذہبی جسم فروشی کے حوالے سے تحقیق کرنے والے کسی شخص کو اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس انتہائی شرمناک برائی کو چھپانے کے لیے اسے مذہب کا لبادہ پہنایا جاتا رہا ہے۔ درحقیقت کسی بھی ایسی جنسی برائی یا کراہت انگیز کجروی کا نام بتانا مشکل ہے، جو مذہب کے دیے ہوئے خوشنما نام کے پردے میں مروج نہ رہی ہو۔ یہ بات صرف غیر وحشی اقوام ہی پر صادق نہیں آتی ہے بلکہ مورمنوں کے کثیر زوجگی اور اونائیڈا کمیونٹی کی جنسی سرگرمیاں حالیہ ادوار اور تہذیب یافتہ ملکوں کی مثالیں ہیں۔ موجودہ دور میں پیرس اور لندن کے کجرو شیطان پرست اسی روش کی مثال ہیں۔

❀❀❀

آٹھواں باب

بائبل اور جسم فروشی

بائبل اور خاص طور پر عہدنامۂ قدیم میں عیسائیت کے ظہور سے پہلے موجود جسم فروشی کے حوالے سے کافی معلومات ملتی ہیں۔ مذہبی معلم اور پادری ان معلومات کے حامل مقدس کتاب کے صفحات کو جلدی جلدی سامنے لے آتے ہیں لیکن کچھ خاص شہوانی (Erotic) عبارتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سینٹ جیروم کے زمانے تک ایزکائیل کی کتاب (The Book of Ezekiel) کو کم عمر افراد کی پہنچ سے دور رکھا جاتا تھا۔ جس زمانے کا ذکر عہدنامۂ قدیم میں ملتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں جسم فروشی کو ایسے ہی دیکھا جاتا تھا جیسے آج کے تہذیب یافتہ ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ درست ہوگا کہ جبر وسزا کے مختصر وقفوں کے علاوہ، جس پر ہم ایک الگ باب میں بات کریں گے، جسم فروشی کے حوالے سے معاشرہ کے مجموعی ردِعمل میں کوئی قابلِ تعریف تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ موجودہ زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی سب کے سامنے تو طوائف کی مذمت کی جاتی تھی لیکن تنہائی میں اس کے دھندے کو فروغ دیا جاتا تھا۔

ان مقدس کتابوں میں جسم فروشی کرنے والی عورتوں کی تو مذمت کی گئی ہے لیکن طوائف پرست مردوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ عورت کے حوالے سے مرد کا رویہ آفاقی طور پر یہ رہا ہے کہ اپنی رشتہ دار عورتوں کے علاوہ ہر عورت کو ورغلایا پھسلایا جاتا ہے۔

جب مردانہ جسم فروشی کا ذکر آتا ہے تو عہد نامہ قدیم کا رویہ مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے اور عیسائی ملکوں میں سدومی کے حوالے سے صدیوں موجود رہنے والے معاشرے کے ردِ عمل پر یہاں ایک نیا رجحان غالب آجاتا ہے۔ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ طوائفیں مختلف خوشنما ناموں کے تحت اس زمانے میں ساری معلوم دنیا کے بیشتر معبدوں سے وابستہ ہوتی تھیں اور یہودی معبد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ تاہم بعض اقوام میں ایسا تھا کہ جسم فروش مرد بھی معبدوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ یہودیوں نے سدومی کی مذمت اس لیے کی تھی کہ یہ ان کی ایک مدِ مقابل قوم کی خصوصیت تھی۔ ویسٹر مارک نے لکھا ہے کہ لفظ کادیش، جس کا ترجمہ سدومیت پسند کیا گیا ہے، ایک ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا تھا جو کہ کسی دیوتا کے لیے وقف ہوتا تھا اور ایسا لگتا ہے کہ وہ دیوتاؤں کی ماں ڈیاسیریا کے لیے وقف ہوتے تھے۔ (Edward Westermarck, The Origin and Development of The Moral Ideas) یہودی تصور کے مطابق ایک خدا کے علاوہ دوسرے دیوتاؤں کو پوجنا سب سے بڑا گناہ تھا۔ اس حوالے سے احکامِ عشرہ کا پہلا حکم قابلِ غور ہے۔

عہد نامہ قدیم میں سدوم اور گوموراہ میں غیر فطری جنسی فعل عام ہو جانے کی وجہ سے ان کی بربادی کا ذکر ملتا ہے۔ بائبل میں متعدد جگہوں پر سدومی کی مذمت کی گئی ہے:

"تم مردوں کے ساتھ عورتوں کی طرح مت لیٹنا' یہ گناہ ہے۔

(Leviticus XVIII.22)

"اگر کوئی مرد کسی دوسرے مرد کے ساتھ اس طرح لیٹے جیسے عورت کے ساتھ لیٹتے ہیں تو دونوں گناہگار ہیں اور ان کی سزا موت ہے۔ ان کا خون انہی کے سر ہے۔" (Leviticus XX.13)

"اور اس ملک میں بھی سدومیت پسند موجود تھے اور انہوں نے وہی کچھ کیا جو کچھ کہ بنی اسرائیل سے پہلے والی وہ قومیں کرتی تھیں جنہیں خدا نے تباہ کر دیا تھا۔ (I Kings XIV. 24)

عیسائیت نے جنسی عمل کی ہر صورت کی مذمت کی' خواہ وہ شادی کر کے کیا جائے یا شادی کے بغیر۔ سینٹ پال نے تجرد اور عصمت کی ایسی شان بڑھائی کہ وہ اوائلی عیسائیت کے نمایاں اوصاف بن گئے۔ جنس کے حوالے سے اس روش کے زیراثر ہی یہ قانون بنایا گیا تھا کہ کوئی بھی ایسے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ مرد اور عورت چرچ کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکتے جنہوں نے گزشتہ رات جنسی عمل کیا ہو۔

اسی زمانے میں ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ طوائف یا زانیہ کو موت کی سزا دیئے جانے کا قانون منسوخ کر دیا گیا۔ یسوع کی تعلیمات صرف معافی اور خیرات پر مبنی تھیں۔

نواں باب

تہذیب اور جسم فروشی

مذہبی جسم فروشی کے رواج پا جانے کے بعد اس کا موجودہ زمانے میں مروج پیشہ ورانہ جسم فروشی میں ڈھل جانا ناگزیر تھا۔ اسی طرح ہر ایسے ملک میں جسم فروشی کا فروغ پانا ناگزیر تھا جہاں صرف ایک شادی کا رواج ہو۔ اسی طرح جسم فروشی کا مشنریوں کے ذریعے غیر تہذیب یافتہ اور نیم تہذیب یافتہ ملکوں میں پہنچنا ناگزیر تھا۔

ہم جسم فروشی کے ارتقا کا مرحلہ وار سراغ پا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے آتی ہے غیر مہذب اور وحشی اقوام کی جنسی بے راہروی' پھر مذہبی یا مقدس جسم فروشی' اور آخر میں پیشہ ورانہ جسم فروشی' جو کہ آزادانہ (فری لانس) بھی ہو سکتی ہے اور چکلوں والی بھی۔ اکثر ایسا ہو سکتا ہے کہ جسم فروشی کی ایک قسم کو دوسری قسم کے ساتھ اس قدر خلط ملط کر دیا جاتا تھا یا ظاہری طور پر ایسا مذہبی لبادہ اوڑھا دیا جاتا تھا کہ یہ جاننا مشکل ہے کہ مذہبی جسم فروشی کا اختتام کہاں ہوا تھا اور پیشہ ورانہ جسم فروشی کہاں شروع ہوئی تھی۔ وجہ کچھ بھی پیش کی جائے' اس میں رقم کا عمل دخل ہو ہی گیا تھا۔ ہیروڈوٹس کے بقول اہرام طوائفوں کی کمائی ہوئی رقم سے تعمیر کیے گئے تھے۔ چیوپس اس حد تک چلا گیا کہ اس نے اپنے نام سے موسوم اہرام کی تعمیر کے لیے رقم کے حصول کے واسطے اپنی بیٹی کو طوائف بنا دیا تھا۔ بیشتر اوقات ایسا ہوتا کہ جب دوسرے قبائل غالب آ جاتے تو معبدوں کی طوائفوں کو عوامی چکلوں میں جسم فروشی

کرنے کے لیے بٹھا دیا جاتا تھا۔

یونان میں جسم فروش مردوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اس حقیقت سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں ہے۔ جدید تہذیب میں بھی جسم فروش مردوں کی تعداد کم نہیں ہے' جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ عورتوں کو ــــ بیوی' بیٹی اور دیگر رشتہ دار معزز عورتوں کو ــــ ایسے دیکھا جاتا تھا جیسے فرنیچر کو' مکان کو اور گایوں' بھیڑ بکریوں کو۔ یہ عورت پر مرد کا پرانا حق تھا' جو کہ چار ہزار سال سے چلا آ رہا تھا۔ بیوی صرف گھر تک محدود رہا کرتی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے خاوند کی خدمت کرنا' بچے پیدا کرنا' انہیں پالنا پوسنا اور گھر کے کام کاج کرنا تھا۔ جس وقت یہ معزز شادی شدہ' ایک حد تک نیک عورت اپنے حقیر فرائض سرانجام دے رہی ہوتی تھی' اس وقت اس کا شوہر بجی سنوری عورتوں کی صحبت میں عیش کر رہا ہوتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کیا انوکھی بات ہے' یہ سب تو موجودہ دور میں بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات درست ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم یونان میں ایسی سرگرمیوں کو پوشیدہ نہیں رکھا جاتا تھا ــــ وہ ہر کام کھلے عام کرتے تھے۔ یونانی مردوں کی بیویوں اور ہمسایوں' سب کو' ان کی سرگرمیوں کا علم ہوتا تھا۔ مزید برآں اعلیٰ ترین طبقے کی طوائفیں' جنہیں ہیتاری کہا جاتا تھا' معاشرے میں عزت اور وقار کی حامل ہوتی تھیں' نیز وہ کسی دوسرے خوشنما نام کے پردے میں اپنا دھندہ کرنے پر بھی مجبور نہیں ہوتی تھیں۔ یہ ہیتاریاں اس زمانے کے امیر ترین' سب سے زیادہ مہذب اور انتہائی اعلیٰ رتبوں کے حامل یونانیوں کی دوست ہوا کرتی تھیں۔ وہ ایسی خوبصورت' تعلیم یافتہ' مہذب اور کشش انگیز عورتیں ہوتی تھیں جو ہر حوالے سے ان نیکوکار بیویوں پر برتری حاصل کر چکی تھیں جو بچے پیدا کرنے اور انہیں پالنے پوسنے ہی میں مصروف رہتی تھیں۔ ایسی ہی طوائفوں میں سے ایک کا نام ایسپازیا ہے' جو اس قدر اختیارات اور اثر و رسوخ کی حامل تھی کہ کوئی ملکہ بھی اس سے حسد کرنے لگتی۔ یہ طوائف صدیوں سے مشہور چلی آ رہی ہے۔ اس کے عاشقوں میں ایلسبیا ڈیز اور سقراط جیسے لوگ شامل تھے۔ آخر میں اس نے پیریکلیز سے شادی کر لی تھی۔ ایک اور طوائف' جس کا نام بارکس تھا' ہیپر پڈیز کی داشتہ تھی۔

تھارگیلیا نامی طوائف زیریکس کی بااعتماد رفیق اور محبوبہ تھی۔ آرکیانا سا نامی طوائف افلاطون کی معشوقہ تھی۔ ناتھیناڈ انفیلز کے ساتھ رہتی تھی۔ فرین نامی طوائف کے عاشقوں کی تعداد اَن گنت تھی، جن میں ہیپر یڈیز، اپیلیز اور پریکسیٹیلز شامل تھے۔ ان کے علاوہ بھی بیشمار طوائفیں موجود تھیں ـــ فہرست لامختتم ہے۔

ہیتاری کہلانے والی ان طوائفوں کی خدمات صرف دولت مند اور بااثر شہری ہی حاصل کر سکتے تھے۔ ان طوائفوں کا رہن سہن، پہناوا اور رہائش اتنی مہنگی تھی کہ صرف کروڑپتی افراد ہی ان سے لذت اندوز ہو سکتے تھے۔ ڈیموستھینیز نے اپنی دولت لائیس پر لٹا دی تھی جبکہ بابل کی دولت تھیونیس پر نچھاور ہو گئی تھی۔

یونان کے عام شہریوں کو پست درجے والی طوائفوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ان گھٹیا طبقے کی طوائفوں کو اشرافیہ طبقے کی ہیتاریوں سے مختلف نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ مختلف سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ کورنتھ میں زہرہ دیوی کا معبد واقع تھا، جس میں پوری ایک ہزار ڈکٹیر ائڈیز یعنی گھٹیا درجے کی طوائفیں موجود ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایتھنز اور دوسرے شہروں میں موجود معبد دوسرے ملکوں سے آنے والے بحری جہازوں کے ملاحوں کی جنسی ضروریات پوری کرتے تھے۔ اس قسم کے معبد ہر ساحلی شہر میں موجود تھے۔ یہاں ہر قسم کی جنسی لذتیں سستے داموں حاصل کی جاسکتی تھیں۔

جس پہلے عوامی چکلے کا باقاعدہ ریکارڈ دستیاب ہے، اسے سولن نے ایتھنز میں کھولا تھا۔ سولن نے اپنے اس عمل کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ اگرچہ جسم فروشی ایک برائی ہے، تاہم یہ ایک ناگزیر برائی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے اپنے اس چکلے کے ذریعے بے پناہ دولت اکٹھی کر لی تھی۔ سولن کے چکلے میں رہنے والی طوائفوں کو اپنی فراہم کردہ خدمات کے عوض صرف کھانا اور لباس ملتا تھا۔ انہیں حاصل ہونے والا معاوضہ ریاست کو چلا جاتا تھا۔ اس قسم کے چکلوں کو ڈکٹیریا کہا جاتا تھا اور ان میں رہنے والی طوائفوں کو ڈکٹیر ائڈیز کہا جاتا تھا۔ ان چکلوں میں آنے والے مردوں کی تعداد کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ طوائفوں کے

معاوضے سے ایک وسیع و عریض معبد تعمیر کیا گیا تھا' جس کی آرائش بھی انہی کی رقم سے کی گئی تھی۔

پورے قدیم یونان میں یہ رواج عام تھا۔ سولن کے عائد کردہ ضابطوں کو بہتر بنایا گیا اور طوائفیں بتدریج غلامانہ حالات سے نکل آئیں' تاہم وہ ریاست کو ٹیکس ادا کرنے کی پابند ہوتی تھیں۔ ڈکٹیر ائڈیز گھٹیا درجے کی طوائفیں ہی رہیں۔ وہ ایتھنز کی بندرگاہ پر پھرتی رہتی تھیں اور گاہک مل جاتا تو اسے لے کر نزدیک ترین ڈکٹیریا (چکلے) میں چلی جاتیں اور عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر اس کی جنسی بھوک کو مٹاتی تھیں۔ ان طوائفوں کا معاوضہ بہت تھوڑا اور متعینہ ہوتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان عوامی چکلوں کے چلانے پر کچھ پابندیاں بھی عائد تھیں۔ چکلا کھولنے والے پر لازم تھا کہ وہ ریاست کو ٹیکس ادا کرے۔ اسی طرح سستی طوائفوں کو بھی ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔ ان جیسی گھٹیا درجے کی طوائفیں موجودہ زمانے میں جنوبی امریکہ کی بندرگاہوں میں واقع چکلوں میں ہوتی ہیں۔

بانسری بجانے اور ناچنے والی لڑکیاں جنہیں آلٹیرائڈیز کہا جاتا تھا' لباس' گفتگو اور پرورش و پرداخت کے حوالے سے گھٹیا درجے والی طوائفوں سے برتر ہوتی تھیں۔ وہ پیشہ ور موسیقار ہوتی تھیں۔ انہیں سرکاری اور نجی رقص و نغمہ کی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ مہمانوں کو موسیقی کے ذریعے تفریح فراہم کرنا تو ان آلٹیرائڈیز کے پیشے کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ انہیں دوسری خواہشیں بھی پوری کرنا پڑتی تھیں۔ ایتھینیاس' لوسیان' اینٹی فینیز اور دوسرے معاصر مصنفوں کی کتابوں سے اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ ایسی لڑکیاں جنسی ضروریات بھی پورا کرتی تھیں نیز اس حقیقت کا بھی پتا چلتا ہے کہ جنسی خدمات فراہم کرنے کا سلسلہ صرف مردوں تک ہی محدود نہیں تھا۔ بانسری بجانے والی زیادہ خوبصورت اور باصلاحیت لڑکیوں سے اکثر ممتاز اور بااختیار لوگ عشق کرتے تھے۔ مشہور اور بدنام بانسری نواز لڑکی لامیا دیمیتریئس کی داشتہ تھی۔ اس پر نچھاور ہونے والی بے پناہ دولت نے اسے زہرہ دیوی لامیا کا نام دلایا اور اس کے اعزاز میں ایک معبد تعمیر کروایا گیا۔

قدیم یونان سے روم کا رخ کیا جائے تو ہمیں پرانے مورخوں اور ادیبوں کی تحریروں میں جسم فروشی کے مستقل حوالے ملتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کے روم میں جسم فروشی کو جس نظر سے دیکھا جاتا تھا' موجودہ زمانے کے انگلینڈ میں بھی ویسی ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یونانیوں کے برعکس روم کے لوگ طوائفوں کے ساتھ کھلے عام تعلقات رکھنے سے شرماتے تھے۔ وہ اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے ایسے چکلوں یا طوائفوں کے گھروں میں چھپ کر جاتے تھے' جن کا پتا ان کے عزیز رشتہ داروں اور دوستوں کو نہیں ہوتا تھا۔ یہ رویہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا بیسویں صدی کے پہلے نصف میں انگلینڈ میں عام تھا اور انگریز دوسرے لوگوں کی نظروں سے چھپتے چھپاتے تاریک اور کم آمدورفت والی گلیوں میں واقع چکلوں میں آیا جایا کرتے تھے۔

رومنوں نے ہی جسم فروشی کے حوالے سے ابتدائی قانون بنائے تھے۔ روم میں جسم فروشی کرنے والی عورتوں کو اپنے نام حکومتی رجسٹروں میں درج کروانے کا ویسا ہی قانون رائج تھا' جیسا کہ موجودہ زمانے میں مختلف ملکوں میں رائج ہے۔ البتہ یہ فرق ضرور نظر آتا ہے کہ روم میں جسم فروش عورتوں کا طبی معائنہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس امر کا بھی خاصا امکان ہے کہ اس زمانے میں روم والوں کو جسم فروشی کا اور جنسی بیماریوں کے باہمی ربط کا علم نہ ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ہے جس سے پتا چلے کہ قدیم روم میں آتشک یا سوزاک جیسی بیماریاں عام تھیں اور اگر عام تھیں بھی تو کیا انہیں جنسی بیماریاں سمجھا جاتا تھا۔

روم میں یہ مقولہ عام تھا کہ ''جو لڑکی ایک بار جسم فروش بن گئی' وہ ہمیشہ طوائف رہے گی۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس لڑکی پر ایک بار عوامی طوائف کا ٹھپہ لگ جائے' وہ اس پیشے کو کسی بھی وجہ سے ترک کر دیتی تو رجسٹر سے اس کا نام خارج نہیں کیا جاتا تھا۔ ان رجسٹرڈ طوائفوں پر پابندی ہوتی تھی کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنیں اور اپنے بالوں کو پیلا یا لال یا نیلا رنگ کروائیں۔ چکلوں میں رہ کر جسم فروشی کرنے والی عورتیں اس قانون سے مستثنیٰ ہوتی تھیں۔ یہ اور اس جیسے دوسرے قوانین

یقیناً اس لیے بنائے جاتے تھے تاکہ لڑکیوں کی اس پیشے میں آمد روکی جائے نیز طوائف بن جانے والی لڑکیوں کی قدرومنزلت ہرممکن طریقے سے گھٹا دی جائے۔ تاہم خصوصی لباس پہننے کے قانون کی حقیقی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ طوائف کے پیشے کو ذلیل کیا جائے' بلکہ بعض اوقات تو اس کا واحد مقصد یہ ہوتا تھا کہ مرد طوائفوں کو باآسانی پہچان سکیں۔

جسم فروشی جیسے انتہائی ترغیب آمیز اور آفاقی پیشے کے حوالے سے قوانین بنانا ایک الگ بات ہے اور ان قوانین کو نافذ کرنا دوسری بات ہے۔ رومن مؤرخوں کی کتابوں کے مطالعے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایسی جسم فروش عورتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جنہوں نے اپنا نام رجسٹر نہیں کروایا تھا اور پیشہ کر رہی تھیں۔ اس طرح دوسرے فوائد حاصل کرنے کے علاوہ وہ رجسٹرڈ طوائفوں کے برعکس ٹیکس ادا کرنے سے بھی بچ جاتی تھیں۔

بیشتر رجسٹرڈ طوائفیں چکلوں میں پیشہ کرتی تھیں۔ ان چکلوں کو روم میں لوپانار یا کہا جاتا تھا۔ یا تو وہ چکلوں میں مستقل طور پر رہتی تھیں یا پھر چکلوں کے مالک انہیں عارضی طور پر رکھ لیا کرتے تھے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ گلیوں میں گھوم پھر کر گاہک ڈھونڈنے والی طوائفیں ضرورت کے وقت کسی چکلے میں کوٹھڑی یا کمرا کرائے پر لے لیا کرتی تھیں۔ تاہم سب طوائفیں چکلوں میں نہیں بیٹھتی تھیں۔ رجسٹرڈ طوائفوں پر چکلوں میں بیٹھنے کی پابندی عائد نہیں تھی۔ غیر رجسٹرڈ طوائفیں چکلے اس لیے استعمال نہیں کر سکتی تھیں کہ ایسا کرنا ان کی قانون شکنی کا اعتراف ہوتا' لہٰذا وہ اپنے گھروں کو جسم فروشی کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ گلیوں ہی میں اپنے گاہکوں کو جنسی تسکین مہیا کرتی تھیں۔ یہ عمل اس لیے کم خطرناک تھا کہ اس زمانے میں گلیوں میں روشنی (Street-Lighting) نہیں ہوتی تھی۔

ان غیر رجسٹرڈ طوائفوں کے علاوہ ایسی جسم فروش عورتیں بھی ہوتی تھیں' جن کی ظاہری وضع قطع اور ادب آداب معزز خواتین جیسے ہوتے تھے اور اس پردے میں وہ عوام سے اپنے حقیقی پیشے کو کامیابی سے چھپائے رکھتی تھیں' جیسا کہ ہر اس ملک میں

ہوتا ہے جہاں جسم فروشی موجود ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں قدیم روم کے فیشن ایبل طبقے میں گھل مل جاتی تھیں۔ ان عورتوں نے اپنی جنسی خواہشیں پوری کرنے کے لیے غلام رکھے ہوئے تھے۔ دراصل یہ عورتیں سلطنتِ روما کے انتہائی بااختیار اور طاقتور گورنروں اور حکمرانوں کی بیویاں ہوتی تھیں۔ وہ ایسی طوائفیں تھیں جو نیرو، ٹلیکس، ویسپاسیان، سیویرس، ٹائٹس، ڈومٹیئن اور دیگر مشاہیر رومنوں کی جنسی بھوک مٹاتی تھیں۔

قدیم روم میں محرمات سے مباشرت بھی عام تھی۔ ڈومٹیئن اپنی بھتیجی کے ساتھ جنسی عمل کیا کرتا تھا۔ نیرو نے اپنی بہنوں کے ساتھ مباشرت کی تھی۔ کوموڈس بھی محرمات سے مباشرت کرتا تھا حالانکہ اس کے محل میں اپنے زمانے کی تین سو خوبصورت ترین لڑکیاں موجود تھیں۔ کجرو جنسی عفریت الیگابالس دن رات اپنے محل کی طوائفوں میں عریاں ہو کر خرمستیاں کرتا تھا۔

روم میں جسم فروشی کا احوال ابتدائی عیسائیوں کے تذکرے کے بغیر ادھورا رہے گا۔ یہ عیسائی چھپ کر اپنے مذہب پر عمل کرتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے تمام ملکوں میں، کہ جہاں جسم فروشی کو سرکاری اور عوامی سطح پر حقارت اور غصے سے دیکھا جاتا ہو، مرد غیر ملکی یا ''کافر'' طوائفوں کو اپنی ہم نسل یا ہم مذہب طوائفوں کے مقابلے میں زیادہ حقارت اور غصے سے دیکھتے ہیں۔ جنگ ہو کہ امن دشمن یا کمزور اقوام کی عورتوں سے ہمیشہ غالب اقوام کے افراد نے زنا بالجبر کیا ہے، خواہ وہ اقوام وحشی تھیں خواہ تہذیب یافتہ۔ سیوٹونیئس کے بقول قدیم روم میں سزائے موت پانے والی ہر عورت کو یہ سزا دینے سے قبل جلاد اس کے ساتھ زنا کرتا تھا۔ لہٰذا اس حقیقت پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ جب کوئی دوشیزہ عیسائی مذہب پر کاربند پائی جاتی تو اسے زبردستی چکلے میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کے سامنے آنے سے پتا چلتا ہے کہ عیسائیت میں جسم فروشی کے حوالے سے اتنا نرم گوشہ کیوں پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عیسائیت سے پہلے مذہبی جسم فروشی (Religious Prostitution) کو نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا بلکہ اسے ہمہ گیر منظوری حاصل ہوتی تھی، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ایسی عورتوں کو طوائفیں نہیں بلکہ ''پجارنیں''

یا ''دیوتا کی بیویاں'' تسلیم کیا جاتا تھا۔ عیسائیت جسم فروشی کا گناہ کرنے والی عورتوں کو توبہ کرنے پر تمام تر مذہبی فوائد اور حقوق دیتی تھی۔

چرچ کے بہت سے فادروں نے جسم فروشی کو دو بڑے شر میں سے کمتر شر قرار دیا تھا۔ اس سے ہمہ گیر برداشت کا طویل دور شروع ہوا' جو کہ بتدریج جسم فروشی کی مکمل منظوری پر منتج ہوا۔ ایسے یورپی ملکوں میں یکے بعد دیگرے رومن قوانین اور ضابطوں کو اپنایا گیا' جہاں بڑے شہروں میں جسم فروش عورتیں کافی تعداد میں ہوا کرتی تھیں۔ یورپی ریاستیں یا ایسے شہر' جہاں جسم فروش عورتیں زیادہ تعداد میں پیشہ کرتی تھیں' طوائفوں سے یا چکلوں کے مالکان سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں چکلے شہری زندگی کا اتنا اہم حصہ بن گئے تھے کہ شہر کے حکام شاہی خانوادے کے افراد' ممتاز لوگوں یا دوسرے شہروں سے آنے والے اہم مہمانوں کے لیے ان چکلوں میں پیشہ کرنے والی عورتوں کو بلامعاوضہ بلایا کرتے تھے۔ برکرڈ نے اپنی مطبوعہ ''ڈائری'' میں پوپ کے نجی کمروں میں برپا ہونے والی رنگ رلیوں کا احوال لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ سیزر اور لیوکریزیا بورگیا سمیت متعدد لوگ پوپ کے ہاں مہمان تھے۔ ان مہمانوں کی تفریح طبع کے لیے پچاس ننگی طوائفوں نے رات کے کھانے کے بعد رقص پیش کیا تھا۔ اس زمانے میں پوپ کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ چکلوں سے حاصل شدہ ٹیکسوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پورے یورپ میں ریاستیں یا شہر طوائفوں سے نہ صرف ٹیکس وصول کرتے تھے بلکہ معزز مہمانوں کے لیے ان کی خدمات بلا معاوضہ حاصل کرتے تھے۔ 1347ء میں نیپلز کی ملکہ جوہانا نے ایوگنن میں ایک چکلا کھلوایا تھا' جہاں اہم عہدیدار اور ممتاز حیثیت کے حامل مرد بلا معاوضہ جا سکتے تھے۔ 1434ء میں بادشاہ سگسمنڈ نے الم (ULM) کا دورہ کیا تو وہ عوامی چکلوں میں بھی گیا تھا۔ ہر شاہی محل کا اپنا چکلا ہوا کرتا تھا اور بادشاہ جب بھی کہیں جاتا اس کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں طوائفیں ہوتی تھیں۔ چارلس دی بولڈ نے اپنے اور اپنے درباریوں کی جنسی تسکین کے لیے چار ہزار طوائفیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ جب بھی فوج کہیں حملہ کرنے یا دفاع کے لیے روانہ

ہوتی تو اس کے پیچھے پیچھے طوائفوں کا ریوڑ بھی جاتا تھا۔ صلیبی جنگیں لڑنے والے مقدس صلیبی جنگجوؤں کے ہر لشکر کا اپنا چکلا ہوتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ راسخ العقیدہ فرانسس اول نے بھی لشکر کے ساتھ بھیجنے کے لیے طوائفوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس امر کا انکشاف شاہی خزانے کے حساب کتاب والی کتابوں سے ہوا ہے۔ اب سے تھوڑا عرصہ پہلے تک مختلف خوشنما ناموں کے پردے میں لشکروں کے ساتھ طوائفوں کو بھیجا جاتا رہا ہے۔

اگر جسم فروشی کے حوالے سے مختلف حکومتوں، خصوصاً انگریزی بولنے والی قوموں کے منافقانہ طرزِ عمل کو سامنے رکھا جائے تو ازمنۂ وسطیٰ کے مذکورہ بالا حالات انتہائی پست اور غیر اخلاقی دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس زمانے میں طوائفوں سے کھلے عام میل جول رکھنا ایسا ہی تھا جیسا کہ آج کے زمانے میں لوگوں کا نائٹ کلبوں میں جانا۔ پرانے زمانے میں تفریح کے لیے چکلوں میں جانا اتنا ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جو سرکاری حکام ریاست کے کام سے سفر پر جاتے تو اس دوران وہ چکلوں میں خرچ ہونے والی رقم اپنے سفر کے دیگر اخراجات ساتھ حکومت سے وصول کیا کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں بھی بعض ایسی ریاستیں اپنے حکام کو ایسی سہولت مہیا کرتی ہیں، جہاں طوائفوں کے ساتھ میل جول کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ شاید پوری تاریخ میں چودھویں اور پندرہویں صدیوں جیسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ جب طوائفوں کو نہ صرف قبول کر لیا گیا تھا بلکہ انہیں جسم فروشی کے نام سے ہی پیشہ کرنے کی اجازت تھی۔ بادشاہوں کے محلات سے منسلک چکلے شاندار عمارتوں میں قائم ہوتے تھے۔ ان میں جو عورتیں رہتی تھیں وہ نہایت عمدہ ملبوسات پہنا کرتی تھیں۔ شاہی چکلے کے انچارج کا کام ویسا ہی تھا جیسا کہ موجودہ زمانے میں دلال کہلانے والے لوگ کرتے ہیں، یعنی چکلے کے لیے حسین و جمیل لڑکیوں کو خرید کر لانا۔ تاہم جس زمانے کا تذکرہ ہم کر رہے ہیں، اس زمانے میں چکلے کے انچارج کو ''طوائفوں کا بادشاہ'' (King of Prostitutes) کہا جاتا تھا۔ اس کی خاتون ہم منصب بھی، جو کہ موجودہ زمانے کے چکلوں کی میڈم کے مماثل تھی، شاہی درباری ہوتی تھی

اور کافی اختیارات اور وقار کی حامل ہوتی تھی۔

''اصلاح'' (Reformation) کا آغاز ہوا تو جسم فروشی کو مختلف خوشنما ناموں کے پردے میں چھپانے کے رجحان کی بھی ابتدا ہوئی۔ اٹلی اور فرانس میں یہ رجحان اپنے عروج کو پہنچا۔ انگلینڈ میں بھی جسم فروشی کو خوشنما ناموں کا نقاب پہنایا گیا۔

پرانے زمانے میں چکلوں میں جانے والے مردوں کی تفریح طبع کے لیے بھانڈ اور مسخرے بھی چکلوں میں موجود ہوتے تھے۔ ڈوسے نے Illustrations of Shakespeare and of Ancient Manners میں لکھا ہے کہ ''اس ڈرامے (Timon of Athens) میں مسخرے کا کردار بہت دھندلا اور غیر اہم ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے درست کہا ہے کہ وہ السبیاڈیز کی ایک داشتہ سے متعلق دکھائی دیتا ہے۔ بہت سی قدیم تصویروں سے عیاں ہوتا ہے کہ مسخرے اس طرح کی عورتوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ ایسے شواہد سے یہ اندازہ لگانا بھی ممکن ہے کہ بیشتر چکلوں میں ایسے کرداروں کا انتظام کیا جاتا تھا' جو چکلوں میں آنے والے مردوں کو فحش لطیفوں سے لطف اندوز کرتے تھے۔ Measure For Measure میں ایک ایسا ہی شخص ملتا ہے' جو کہ شراب فروش بھی ہوتا ہے۔ Antony and Cleopatra کے پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں ہم طوائف کے مسخرے کے بارے میں سنتے ہیں۔''

پرانے زمانے میں تو ایسا بھی تھا کہ چکلوں کو زیادہ باعزت نام دیے گئے تھے۔ اکثر و بیشتر انہیں حمام کہا جاتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کا ہر حمام چکلا ہوتا تھا۔ جماع اور نہانے کے تعلق سے' جس سے ہر ماہرِ جنسیات خوب آگاہ ہے' قدیم لوگ بھی ناواقف نہیں تھے۔ لندن کے بدنامِ زمانہ ''سٹیوز'' (حمام) چکلے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے کی ساری تہذیب یافتہ دنیا میں حماموں اور جنسی بے راہروی کا تعلق آفاقی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ 1649ء میں پیٹر چیمبرلین نے ایک قانون پارلیمنٹ میں منظوری کے لیے پیش کیا تھا جس کے تحت انگلینڈ کے تمام شہروں میں حمام تعمیر کیے جاتے۔ یہ قانون تو منظور نہیں ہوا تھا' تاہم چکلوں پر اور وہاں آنے جانے والوں پر پارلیمنٹ نے کچھ ضابطے لاگو کر رکھے تھے۔ مثلاً کسی جنسی مرض کی

شکار عورت کو چکلے میں پیشہ نہیں کرنے دیا جاتا تھا' نہ ہی ایسی عورت شادی کر سکتی تھی۔ شاید انگلینڈ یا دنیا کے کسی بھی ملک میں جنسی امراض کے پھیلاؤ کو روکنے کے یہ پہلی کوشش تھی۔ اس قانون پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لیے کوئی کانسٹیبل یا افسر ہفتے میں ایک بار ''سٹیوز'' کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ 1545ء میں ریفارمیشن پارٹی نے بادشاہ ہنری ہشتم پر زور دیا کہ وہ ساؤتھ وارک کے ''سٹیوز'' کو بند کروا دے اور یوں جسم فروشی کے حوالے سے اس نوع کا انگلینڈ کا پہلا تجربہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ تاہم ''سٹیوز'' کی بندش کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حماموں میں طوائفوں کی فراہمی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کی بجائے حمام شہر کی عورتوں میں زیادہ مقبول ہو گئے اور سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں لندن میں بغیر کسی شرم و حیا کے ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ آرکن ہولز نے 1790ء میں اس طرح کی جگہوں کے حوالے سے لکھا: ''لندن میں بعض ایسے مقامات ہیں جنہیں بیگنیو کہا جاتا ہے' جن کا واحد مقصد لذت کی فراہمی ہے۔ ان کی عمارتیں عظیم الشان ہوتی ہیں جبکہ ان کے اندر موجود فرنیچر کسی شہزادے کے محل کے فرنیچر سے کم قیمتی نہیں ہوتا۔ یہاں مستی طاری کر دینے والی ہر شے مہیا کی جاتی ہے ...... اس قسم کی تفریح بہت مہنگی ہوتی ہے' لیکن اس کے باوجود بعض اوقات بیگنیو ساری ساری رات لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ اکثر بیگنیو کسی نہ کسی تھیٹر کے قریب واقع ہیں یا پھر ان کے اردگرد شراب خانے ہوتے ہیں۔ لندن کے شراب خانوں اور بیگنیوز میں ایک رات میں اس سے زیادہ دولت اڑا دی جاتی ہے جتنی کہ ساتوں متحدہ صوبوں میں چھ ماہ کے دوران خرچ کی جاتی ہے۔''

(M.D.Archenholz, A Picture of England, Dublin, 1970, P.195)

کچھ بیگنیو شراب خانوں سے وابستہ ہوتے تھے جبکہ دیگر خودمختار ہوتے تھے۔ مؤخرالذکر قسم کا سب سے زیادہ بدنام بیگنیو لانگ ایکر کا ڈیوک کا حمام تھا' جسے بعدازاں کنگز بیگنیو کا نام دے دیا گیا تھا۔ دوسرا بدنام ترین بیگنیو کووینٹ گارڈن کا دی ہمز تھا۔

یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے کہ جہاں فرانس سے زیادہ تیزی سے جسم

فروشی نے فروغ پایا ہو۔ نپولین اول کے زمانے میں صورتحال اتنی سنگین ہوگئی تھی کہ اس برائی سے نمٹنے کے لیے خصوصی قانون بنائے گئے۔ یہاں تک کہ پیشہ ور عورتوں کی رجسٹریشن کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ اس زمانے میں دو قسم کی طوائفیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک تو وہ جو چکلوں میں بیٹھتی تھیں اور دوسری وہ جو آزادانہ (فری لانس) پیشہ کرتی تھیں۔ تاہم دونوں کو قانوناً رجسٹریشن کروانا ہوتی تھی۔ ایکٹن نے 1869ء میں ایک مخصوص فرانسیسی چکلے کا احوال یوں قلمبند کیا تھا: ''چکلے کی مالکہ گاہک کا استقبال کرتی اور اسے ایک عالی شان کمرے میں بٹھاتی۔ ایک طرف پڑا ہوا پردہ اٹھایا جاتا تو اس کے سامنے ایک دروازہ آتا' جس میں ایک گول شیشہ لگا ہوا ہوتا تھا۔ وہ اس شیشے کے ذریعے دوسری طرف واقع ایک چھوٹے لیکن خوب سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئیں طوائفوں کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ طوائفیں دیدہ زیب لباس پہنے صوفوں پر بیٹھی ہوتیں۔ ان کی قمیضوں کے گلے کافی کھلے ہوتے تھے جن سے ان کی چھاتیاں جھلکتی تھیں۔ انہوں نے بال بڑے دلکش انداز میں سنوارے ہوتے تھے۔ وہ سب دلفریب اداؤں سے گاہک کو لبھاتی تھیں۔ اسے جو عورت پسند آتی' وہ اس کی نشاندہی کر دیتا تھا...... اگر وہ قریب سے ان طوائفوں کو دیکھنا چاہتا تو اسے اس ڈرائنگ روم میں داخل ہونے اور ان کی صحبت سے لطف اندوز ہونے دیا جاتا ہے۔'' مصنف پیرس کے چکلوں کا تفصیلی احوال لکھتے ہوئے یہ بھی بتاتا ہے کہ ان میں ''مستی طاری کرنے اور شہوت کی آگ بھڑکانے والی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ ان چکلوں میں ایسے ایسے شرمناک مناظر دیکھے جا سکتے ہیں جن میں شاید کوئی حیادار عورت حصہ لینے کی ہمت جیتے جی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے گاہکوں کے پست ترین جذبات بھڑکانے کے لیے زندہ مشینوں کی طرح حرکتیں کرتی ہیں۔''

(William Acton, Prostitution Considered in its Moral, Social and Sanitary Aspects, 1870)

یہ سب کچھ ان چکلوں کی مکینوں کا معمول ہوا کرتا تھا۔

یہ چکلے بہت زیادہ نفع بخش ہوتے تھے۔ مختلف چکلوں میں معاوضہ مختلف

ہوتا تھا۔ پانچ سے لے کر پچیس فرانک تک اور بیشتر چکلوں میں شراب بھی فروخت کی جاتی تھی۔ جہاں تک گلیوں میں گھوم پھر کر جسم فروشی کرنے والی لڑکیوں کا تعلق ہے تو انہیں مذکورہ قانون کے تحت کچھ خاص علاقوں تک محدود کر دیا گیا تھا اور ان پر گاہکوں کو خود بلاوا دینے پر پابندی ہوتی تھی۔ تاہم ان کا بھڑکیلا لباس اور عمومی وضع قطع چیخ چیخ کر گاہکوں کو بلاوے دیتی تھی۔

تھامس لٹل انیسویں صدی کے شروع میں ایمسٹرڈیم کے چکلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ چکلے باقاعدہ لائسنس یافتہ ہوتے تھے۔ اسی طرح ان میں بیٹھنے والی لڑکیاں بھی لائسنس یافتہ ہوتی تھیں۔ چکلوں کے مالک ریاست کو ٹیکس ادا کرتے تھے۔ وہ کہتا ہے ''لوگ ان چکلوں میں کھلم کھلا دادِ عیش دینے آتے ہیں اور کوئی شرم یا جھجک محسوس نہیں کرتے۔ کسی شخص کا ان چکلوں میں دیکھا جانا زیادہ بدنامی کا باعث نہیں ہوتا کیونکہ انہیں بھی دوسری تفریح گاہوں جیسی ایک تفریح گاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تفریح میں موسیقی اور رقص شامل ہوتے ہیں۔ کمرے کے گرد بنی ٹھنی عورتیں، جو کہ رقص نہیں کرتیں، بیٹھی ہوتی ہیں اور آنے والے مرد جب تک چاہتے ہیں ان کے ساتھ گپیں لگاتے اور چہلیں کرتے رہتے ہیں، وہ انہیں شراب اور دیگر اشیائے خورونوش بھی پیش کرتے ہیں۔ جو شخص کسی لڑکی کو رقص کے لیے ساتھ لے جائے وہ چھ پینس ادا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ ہم بستری کرنا چاہے تو اس مقصد کے لیے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں، جن میں بستر اور دیگر ضروری سامان موجود ہوتا ہے۔ لڑکی کو ساتھ لے کر ان کمروں میں چلے جانے اور کچھ دیر بعد واپس آنے کو کوئی زیادہ توجہ نہیں دیتا۔''

(Thomas Little, The Beauty of Sexes, Second Edition, Vol iii,

p.17)

بورکے لکھتا ہے کہ ایمسٹرڈیم کی طوائفیں بہت زیادہ توہم پرست ہوتی تھیں۔ وہ خوش بختی کے لیے اپنے کمروں میں گھوڑے کی لید رکھا کرتی تھیں۔

(J.G.Bourke, Scatologic Rites of all Nations, p.255)

جسم فروشی کو برداشت کرنے کے طویل دورانیے کے بعد، جس کی مثال صرف قدیم تاریخ میں ملتی ہے، جسم فروشی اور طوائفوں کے حوالے سے سخت ردِعمل سامنے آیا اور ہمہ گیر جبر وتعزیر کے دور کا آغاز ہوا۔ دراصل تاریخ کے آغاز ہی سے جسم فروشی کو دبانے یا اسے قانون کے دائرے میں محدود کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں، تاہم سولہویں صدی میں تو پورے یورپ میں جسم فروشی کو جبر وتعزیر کی لہر نے لپیٹ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس رجحان کی وجہ لوگوں میں اخلاقیات اور مذہب کا نیا ابھار تھا، بالخصوص مختلف یورپی ملکوں کے سربراہوں میں۔ یہ مفروضہ غلط ہے۔ ایسا مذہب کی وجہ سے تھا نہ اخلاقیات کی وجہ سے بلکہ ایسا صرف ایک مرض کی وجہ سے تھا۔ اس زمانے میں یورپ کے بہت سے ملکوں میں آتشک کا مرض عام ہو گیا تھا، جس کا ذمہ دار طوائفوں اور چکلوں کو قرار دیا گیا۔ اگرچہ اس الزام میں مبالغہ زیادہ تھا، تاہم اس مرض کے پھیلاؤ میں طوائفوں کا کردار یقیناً اچھا خاصا تھا۔ امیروں، حکمرانوں اور ممتاز افراد نے چکلوں کی سرپرستی کرنا چھوڑ دی۔ جب ان اعلیٰ طبقے کے لوگوں نے جسم فروشی کو تفریح اور لذت کا منبع تصور کرنا ترک کر دیا تو مصلحین کو کھل کر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ ریاست اور چرچ نے مل کر ان بدقسمت عورتوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جو کسی زمانے میں بے مثال قدر ومنزلت کی حامل ہوتی تھیں۔

دسواں باب

برطانیہ میں جسم فروشی

برطانیہ میں تاریخ کے ہر دور میں جسم فروشی موجود رہی ہے اور ہر ملک کی طرح یہاں بھی نشیب و فراز سے گزر چکی ہے۔ ایسے زمانے بھی آئے کہ جب جسم فروش عورتیں تعداد میں بہت ہی زیادہ ہوگئیں اور ایسے دور بھی گزرے کہ جب وہ گلیوں سے غائب ہوگئیں۔ ان نشیب و فراز سے عوامی غم و غصے یا مذہبی تنظیموں کی کارروائیوں کے نتیجے میں اس پیشے کے حوالے سے بننے والی حکومتی پالیسیوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

ایک زمانے میں لندن اور دوسرے صوبائی شہروں کے بیگنیو بہت بدنام ہوتے تھے۔ انہیں ایسی طوائفیں چلایا کرتی تھیں جو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کا خود اپنے جسموں کو بیچنا صحت کے لیے نقصان دہ ہونے کے علاوہ کم منافع بخش ہے۔ بعض اوقات طوائفیں بوڑھی اور بے کشش ہونے کے بعد جسم فروشی کرنے سے معذور ہو جانے پر بیگنیو چلانا شروع کر دیتی تھیں۔

بعض بیگنیو بہت مہنگے ہوتے تھے اور امیر لوگ ہی وہاں جایا کرتے تھے۔ تاہم زیادہ تر بیگنیو سستے ہوتے تھے۔ بیگنیو ایسے بڑے بڑے مکان ہوتے تھے جن میں چھ سے لے کر ایک درجن تک جسم فروش عورتیں رہتیں اور اپنا دھندہ کر سکتی تھیں۔ یہ عیش گاہیں لندن اور دوسرے بڑے صوبائی شہروں اور قصبوں میں موجود تھیں۔ بعض بیگنیو عجیب و غریب وضع کے ہوتے تھے۔ ''یورپین میگزین'' نے ''دی فولی'' (The

(Folly نامی ایک بیگنیو کے حوالے سے لکھا کہ وہ ''ایک بہت بڑا بحری جہاز تھا۔ یہ بیگنیو دریائے ٹیمز میں سرے والی سمت ہنگرفورڈ سٹیئر کے تقریباً بالمقابل لنگرانداز رہتا تھا۔ یہ بحری جہاز ایک تیرتا ہوا مے کدہ بھی تھا۔ اس کے مالکوں کا خیال تھا کہ دریا میں تیرتے ہوئے اس عشرت کدے کا لائسنس لینا ضروری نہیں ہے لہٰذا وہاں کئی سال تک بلااجازت دھندہ ہوتا رہا۔ آخر یہ بیگنیو اتنا بدنام ہو گیا کہ پولیس کو جبراً اسے بند کروانا پڑا۔''

(Quoted be J.P. Malcolm, Anecdotes of London in the Eighteenth Century, Second Edition, 1810, vol. 1 P.231)

جیمز بوسویل نے اپنی کتاب London Journal میں متعدد طوائفوں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا احوال لکھا ہے۔ اس نے ایک طوائف کے ساتھ ویسٹ منسٹر برج پر مجامعت کی تھی۔ اس کے حوالے سے وہ لکھتا ہے ''بہتے ہوئے دریائے ٹیمز کے اوپر اس طوائف نے مجھے بہت زیادہ لذت عطا کی۔'' جنسی امراض کا شکار ہو جانے والا بوسویل ان طوائفوں کو تقریباً ایک شلنگ معاوضہ دیا کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں کھلے عام مجامعت کرنا اس لیے دشوار نہیں تھا کہ روشن گلیاں بہت کم ہوتی تھیں اور پولیس کا نظام بہتر نہیں تھا۔

پیئرس ایگن نے لندن کا ایک اعلیٰ درجے کا چکلہ چلانے والی عورت کا عمدہ خاکہ بیان کیا ہے۔ اس نے انیسویں صدی کے آغاز کے زمانے کا تذکرہ کیا تھا۔ جیری اور ٹام کو لندن کی شبینہ حیات سے متعارف کروانے والا ''دی اوکسونین'' کہتا ہے:

> ''میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن تین حرافاؤں نے آپ کی آنکھوں کو چندھیا دیا ہے' وہ نٹیں ہیں۔ وہ موٹی سے عورت مدر — ہے' جو بہت بدنام نن ہے اور — گرجے سے وابستہ ہے۔ اس کا مکان شاہی محلات سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ اپنے انتخاب کردہ پیشے میں اپنی بیباکی کے باعث بہت

نمایاں ہے۔ وہ اتنی بدنام ہے کہ باقی سب طوائفوں کی بدنامی اس کے سامنے ماند پڑگئی ہے۔ اس مدر کو اپنی ''ساکھ'' کے تحفظ کی بڑی فکر رہتی ہے تاکہ اس کے مکان میں آنے والے گاہک ٹوٹ نہ جائیں۔ مدر بہت چالاک ہے اور کسی ترغیب کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ بڑی سفاک بھی ہے اور برباد ہو جانے والی لڑکیوں کی آہ و زاری کا اس پر بالکل اثر نہیں ہوتا۔ اس کا مقولہ ہے کہ اچھے گاہک کی ہر خواہش پوری کرنی چاہیے ...... وہ کاروبار میں بہت تیز طرار ہے۔

مدر اپنی لڑکیوں کی صحت کا بہت خیال رکھتی ہے۔ وہ ان کے لباس اور آرائش پر بھی بہت توجہ دیتی ہے لہٰذا ایک ایسی لڑکی جو ممکن ہے کل تک جھاڑو دیتی ہو اس کے چکلے میں آکر پریوں جیسی لگنے لگتی ہے۔ وہ میک اپ کی جدید ترین اشیاء استعمال کرتی ہے۔ لباس نہایت عمدہ ہوتے ہیں ...... مدر اپنے ہر گاہک کے ذوق کو خوب سمجھتی ہے ...... اگرچہ حیا سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے تاہم رویوں کے اعتبار سے وہ ایک مہربان اور مہذب عورت ہے۔ وہ نئی آنے والی لڑکیوں کو بھی شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر گاہکوں کو ہر طرح سے لذت مہیا کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ مدر حسین و جمیل لڑکیاں چن چن کر اپنے چکلے میں لاتی ہے۔ اس کے بیگنیو میں ہر کوئی آسکتا ہے بشرطیکہ اس کا تعلق معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے ہو۔''

(Pierce Egan, Life in London, 1869)

اس نے اپنی ادبی دلکشی سے معمور کتاب میں اس زمانے کی طوائفوں کے حوالے سے مزید دلچسپ تفصیلات بھی لکھی ہیں۔ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ جو طوائف زرق برق ملبوسات خرید نہیں سکتی تھی وہ لباس اور دیگر ضروری اشیاء کرائے پر

حاصل کر سکتی تھی۔ کرائے پر لباس دینے والوں کے لیے یہ خطرہ ضرور تھا کہ ممکن ہے لباس اور لڑکی دوبارہ کبھی دکھائی ہی نہ دیں! بعض اوقات چکلوں کی طوائفیں بھی لباس کرائے پر لے لیا کرتی تھیں۔

پست درجے کے چکلوں کے پکے گاہک نہیں ہوتے تھے۔ یہاں عموماً معاشرے کے چھوٹے درجوں والے لوگ آیا کرتے تھے۔ جو مرد ان شراب خانوں میں طے شدہ فیس کے علاوہ کچھ مزید دیئے بغیر نکل آنے میں کامیاب ہو جاتے' وہ خوش نصیب ہوتے تھے کیونکہ طوائفیں اکثر گاہکوں کو لوٹ لیا کرتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ طوائف اس وقت اپنے گاہک کی رقم اڑا لیتی جب وہ نشے میں دھت یا سویا ہوا ہوتا۔ دوسری صورت میں دلال وہاں گھس آتا اور گاہک کو دھمکیاں دے کر رقم چھین لیتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کا ایک مصنف رچرڈ کنگ لکھتا ہے: ''دلال ان طوائفوں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اپنے آپ کو طوائف کا شوہر ظاہر کرتے ہیں۔ دلال طوائف کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ وہ اس کی روٹی کھاتا تھا پس اس کے لیے لڑائی جھگڑے بھی کرتا تھا۔ ایسے مرد شیطانی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ جس طوائف سے وابستہ ہوتے تھے' پہلے ایک گاہک کی صورت میں اپنی ساری جمع پونجی اس پر لٹا چکے ہوتے تھے اور کنگال ہو جانے کے بعد اس کے قرب میں رہنے کے لیے دلالی شروع کر دیتے تھے۔ طوائف گاہک کو پھنسا کر لاتی تو گھر میں داخل ہوتے ہی نوکرانی سے سرگوشی میں پوچھتی کہ کیا اس کا مالک گھر میں ہے؟ نوکرانی پہلے سے سکھائے ہوئے جواب کے مطابق نفی میں جواب دیتی اور بتاتی کہ وہ شہر گیا ہوا ہے اور کل آئے گا۔ اس پر طوائف گاہک کو گھر کے اندر لے جاتی۔ گاہک اپنی ہوس پوری کر لیتا تو وہ اس کے ساتھ معاوضے پر جھگڑا شروع کر دیتی۔ اسی اثنا میں نوکرانی آ کر بتاتی کہ صاحب آ چکا ہے۔ اگر گاہک گھبرا کر مطلوبہ رقم دے دیتا تو اسے جانے دیا جاتا اور اگر وہ دیر کر دیتا تو دلال کمرے میں گھس آتا اور اسے ڈرا دھمکا کر ساری رقم سے محروم کر دیتا۔'' کنگ اس حوالے سے اپنے ایک دیہاتی دوست کا واقعہ بھی بیان کرتا ہے' جو سیر کرنے لندن آیا تھا۔ ''میرے دیہاتی دوست کو ایک نوجوان اور شوخ

چنچل لڑکی نے ورغلا لیا۔ وہ اسے کووینٹ گارڈن کے قریب واقع ایک مشہور بیکنیو میں لے گئی۔ کچھ وقت وہاں گزار کر اس نے میرے دوست کو تجویز دی کہ وہ اس کے گھر چل کر رات گزارے۔ میرا دوست خوشی خوشی اس کے گھر چلا گیا۔ ساری رات بہت مزے میں گزری لیکن صبح ہوئی تو لڑکی نے مطالبہ کیا کہ وہ رہائش کا معاوضہ اور ملازمہ اور اس کی بخشیش بھی دے۔ میرے دوست نے انکار کیا تو دلال کمرے میں آ گیا۔ اس نے دھمکی دی کہ جان پیاری ہے تو رقم دے دو ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے۔ میرے دوست کو رقم سے جان زیادہ پیاری تھی۔ اس نے رقم ادا کی۔ اس مرتبہ اسے طوائف کو اس بات کا بھی معاوضہ دینا پڑا کہ وہ رات بھر جاگ کر پہرا دیتی رہی تھی کہ کہیں وہ معاوضہ دیئے بغیر ہی بھاگ نہ جائے۔ ادائیگی کے بعد دلال نے دیہاتی دوست کے کولہوں پر ٹھوکر ماری۔ وہ زینوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے گرا۔"

(Richard Kind, The Frauds of London Detected, 1770, PP. (16-18

صدیاں گزر گئیں لیکن دلالوں اور طوائفوں کی لوٹ مار کی تکنیک نہیں بدلی۔ موجودہ زمانے کی طوائفیں بھی کنگ کی بیان کردہ تکنیک استعمال کرتی ہیں۔

ولیم لوگن نے طوائفوں کے حالاتِ کار، ان کی کمائی اور نئی طوائفوں کی بھرتی کے حوالے سے معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ چکلے کی مالکہ طوائف کی آدھی آمدنی کی حق دار ہوتی ہے، خواہ وہ نقد رقم کی صورت میں ہو یا تحائف کی صورت میں۔ اس کے علاوہ ہر طوائف کو ایک پونڈ فی ہفتہ چکلے میں رہنے کا کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنے کپڑے بھی خود خریدنے ہوتے ہیں۔ لوگن کہتا ہے: "میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا جس کے ہاتھ فیکٹری میں کٹ گئے ہوئے تھے۔ وہ ایک چکلا چلاتی تھی۔ وہ ریلوے سٹیشنوں پر جا کر دیہات سے آنے والی لڑکیوں کو پھنسا لاتی تھی۔ جب اسے ان کی ضرورت نہیں رہتی تو وہ انہیں اول یا دوم درجے کے چکلوں میں بھجوا دیتی۔ اسے "تازہ بال" فراہم کرنے پر بہت رقم حاصل ہوا کرتی تھی۔"

(William Logan, An Exposure From Personal Observations of Female Prostitution in London, Second Edition, Glasgow, 1843. P.14)

چکلے چلانے والے افراد (مرد وخواتین) کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی نئی خوبصورت لڑکی ہاتھ آتی' وہ شہر کے اعلیٰ طبقے کے مردوں کو خط لکھ کر اطلاع دے دیتے۔ یہ خطوط پینی پوسٹ کے ذریعے بھیجے جاتے تھے۔ جیمز ٹالبوٹ کہتا ہے: ''میرے پاس بہت سے معزز لوگوں کے دیئے ہوئے ایسے متعدد خطوط موجود ہیں' جو انہیں چکلوں کے مالکان نے نئی لڑکیوں کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے بھیجے تھے۔''

(James Beard Talbot, The Miseries of Prostitution. London, 1844)

1841ء میں لندن کے پولیس چیف کمشنر نے ایک رپورٹ میں بتایا کہ شہر میں 3325 چکلے موجود ہیں۔ 1835ء میں مرتب کی گئی ایک رپورٹ میں سر آرتھر ڈی کیپل بروک نے لکھا کہ لیمبیتھ میں 1176 چکلے اور 2033 طوائفیں ہیں۔ بیڈفورڈ چیپل بلومزبری کا ریورنڈ ہیوگز بتاتا ہے کہ ''700 گز کے دائرے میں 24 چکلے ہیں' جن میں سے ہر ایک میں اوسطاً دس طوائفیں موجود ہیں۔'' سٹی مشن کے ایک سیکرٹری ریورنڈ اینیسلے نے بتایا کہ ''نیوکورٹ میں 22 چکلے ہیں جن میں بچوں کے علاوہ 150 جسم فروش عورتیں رہتی ہیں۔''

اس زمانے میں معاشرے کے غریب لوگ گندے علاقوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کے بچے ایسے ماحول میں پروان چڑھتے تھے جو بدی اور جرائم سے بھرا ہوتا تھا۔ ان بچوں کا طوائفیں اور چور بننے کی بجائے تعلیم یافتہ اشخاص بن جانا ایک معجزہ ہی ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرائم اور جسم فروشی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ٹالبوٹ نے انیسویں صدی کے اوائلی عشروں میں لیڈز کی ایک شماریاتی کمیٹی کی ایک رپورٹ کے حوالے سے شمالی شہر کی ناگفتہ بہ حالت کا تذکرہ کیا ہے۔ ''جن میں سے تین چکلے تو نہایت بدنام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بوٹ اور شویارڈ میں ستاون کمروں والے 34 چکلے ہیں' جن میں سے ہر ایک میں اوسطاً چھ طوائفیں دھندہ کرتی ہیں۔ ایک دوسرا محلہ ایسا ہے کہ گندگی اور بے راہروی کی وجہ سے وہاں سے گزرنا قطعاً ناممکن ہے۔'' دستی کھڈیوں پر کام کرنے والوں کے حوالے سے مرتب کی گئی ایک رپورٹ

میں گلاسگو کا اسسٹنٹ کمشنر لکھتا ہے: ''نچلے درجے کی رہائشی عمارتوں میں 10' 12 اور بعض اوقات 20 مرد عورتیں فرش پر عریاں پڑے سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ عمارتیں اتنی گندی' مرطوب اور ٹوٹی پھوٹی ہیں کہ کوئی شریف انسان اپنے گھوڑے کو بھی وہاں باندھنا پسند نہیں کرے گا۔ بعض ٹوٹے پھوٹے اور خطرناک مکانوں کی نچلی منزلوں میں سستی شراب بیچنے والی دکانیں اور سستے ہوٹل ہیں۔ وہاں موجود بہت سی نوجوان لڑکیوں نے گلاسگو پولیس کے چیف کیپٹن ملر سے درخواست کی کہ انہیں مصیبت سے بچایا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ لڑکیاں ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر دھندہ کر رہی ہیں۔ موجودہ اداروں کے تحت تو ان لڑکیوں کی مناسب مدد نہیں کی جا سکتی اور ہر سال سینکڑوں بدنصیب لڑکیاں جسم فروشی' شراب نوشی کی کثرت اور بیماریوں کے ہاتھوں وقت سے پہلے موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔'' بعدازاں کیپٹن ملر نے گلاسگو کے ایسے علاقوں کا دورہ کیا تو اس نے دیکھا کہ ''ساڑھے سولہ فٹ لمبے اور دس فٹ چوڑے کمروں میں 4 اور 5 ستمبر 1840ء کی درمیانی رات چودہ طوائفیں موجود تھیں۔ دیگر اتنے ہی چھوٹے کمروں میں بچوں کے علاوہ 84 طوائفیں موجود تھیں۔ ان میں سے کسی کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ وہ غریب لوگ سخت سردی میں بغیر گرم کپڑوں اور کمبلوں کے رہنے سونے پر مجبور تھے۔''

مسٹر ٹالبوٹ نے ذاتی طور پر بھی تحقیق کی تھی۔ لندن کی صورتحال کے حوالے سے وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے خود لندن کے کئی علاقوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں نے متعدد کمروں کا مشاہدہ کیا اور ہر کمرے میں چار سے دس تک بدقسمت عورتوں کو پایا۔ مجھے پولیس کی تفتیشی رپورٹوں سے پتا چلا تھا کہ ان سب کمروں میں چور' چوری کا مال خریدنے والے اور جسم فروش عورتیں رہتی ہیں۔ میں نے یہاں موجود طوائفوں کی تعداد تو نہیں گنی لیکن وہ بہت زیادہ تھیں۔ یہاں پست ترین کردار کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ مکانوں میں نشئی لوگ اور طوائفیں رہتی ہیں۔ یہاں ایسی عمارتیں بھی ہیں جہاں کتوں کی لڑائیاں اور دیگر بے رحمانہ کھیل ہوتے ہیں۔ لندن کے نو آموز چور یہاں آ کر مہارت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں غلیظ ترین برائیاں عام ہیں۔ میں نے

گزشتہ تین ہفتوں میں چار گلیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ صرف ان چار گلیوں میں 65 چکلے اور 194 طوائفیں ہیں۔ ان تمام چکلوں میں نہایت ہولناک مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں نے اس کے علاوہ جتنے علاقوں کا بھی دورہ کیا' وہاں ایسے ہی مناظر دیکھے۔ میں نے حال ہی میں ریجنٹ پارک کے علاقے میں پارک سکوائر کا دورہ کیا ہے۔ میرے ساتھ سٹی مشن کا ایک سیکرٹری بھی تھا۔ یہاں واقع چار کے علاوہ تمام گھروں میں طوائفیں رہتی ہیں۔ ہر گھر میں تقریباً پانچ طوائفیں رہتی ہیں۔''

(J.B.Talbot, The Misries of Prositution, PP. 23-4)

جیمز ٹالبوٹ نے دوسرے شہروں میں موجود چکلوں کے حوالے سے درج ذیل اعداد و شمار بیان کیے ہیں:

شہر	چکلوں کی تعداد
ڈبلن	355
ایڈنبرگ	219
لیورپول	770
مانچسٹر	308
برمنگھم	797
ہل	175
ناروک	194

آخری شہر کے بارے میں وہ ''نارفوک کرانیکلز'' (2 دسمبر 1843ء) کے حوالے سے لکھتا ہے: ''یہ شہر چوروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں 600 سے زیادہ شراب خانے موجود ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ شراب خانے چکلے بھی ہیں۔ یہ چوروں اور طوائفوں کی آماجگاہ ہیں۔ یہاں چوریوں کے منصوبے تیار ہوتے ہیں' چوری کا مال خریدا بیچا جاتا ہے اور ہر غیر قانونی دھندہ ہوتا ہے۔'' لیڈز کے حوالے سے ولیم لوگن کہتا ہے کہ 1840ء میں' جب شہر کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی' یہاں 175 چکلے موجود تھے' جن سے اوسطاً چار چار طوائفیں وابستہ تھیں۔ ہر چکلے میں ایک ہفتے میں اوسطاً 80 گاہک

آتے تھے اور سب میں مجموعی طور پر 14000۔ ان 700 طوائفوں کی اوسط فی ہفتہ آمدنی تیس شلنگ تھی۔

اس زمانے کے تمام شہروں کے چکلوں کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے: (1) باقاعدہ چکلے۔ (2) ڈریس ہاؤس (3) رہائشی عمارتیں۔ باقاعدہ چکلوں میں دس سے بارہ طوائفیں ہوتی ہیں جنہیں یا تو تنخواہ ملتی ہے یا منافعوں میں سے حصہ ملتا ہے۔ اس کے برعکس ڈریس ہاؤسز میں کام کرنے والیوں کو نہ تو تنخواہ ملتی ہے اور نہ ہی کوئی فیس۔ انہیں صرف کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑے اور رہنے کو جگہ مہیا کی جاتی ہے اور بس۔ وہ ڈریس ہاؤسز میں اپنے گاہکوں سے نہیں مل سکتیں۔ بلکہ گلی میں دھندہ کرنے والی طوائفوں کے حقیقی مفہوم میں باہر جا کر انہیں ڈھونڈتی ہیں۔ ایکٹن کہتا ہے: ''سرکش اور بے ڈھنگے میک اپ والی مخلوق لینگہم پلیس، نیوروڈ کے کچھ حصوں، کو اڈرینٹ، ہے مارکیٹ تھیٹر کے پیری سٹائل، سٹی روڈ اور لائیسیئم میں ہر رات گاہکوں کی تلاش میں نکل آتی تھی۔ طوائفوں کے یہ گروہ لندن میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کو عورتیں ہی چلاتی تھیں۔ یہ بدقسمت طوائفیں تقریباً غلامی کی زندگی گزارتی تھیں۔ ان پر ایک مخصوص علاقے تک محدود رہنے کی پابندی ہوتی تھی۔ آپ انہیں برس ہا برس ایک ہی گلی میں گاہکوں کو پھنساتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ وہ نہ صرف ایک مخصوص گلی تک محدود رہنے کی پابند ہوتی تھیں بلکہ صرف چند گز کے دائرے میں ہی رہا کرتی تھیں۔ اگر کوئی طوائف گاہک پھنسانے میں ناکام رہتی تو اس کی مالکہ اسے بری طرح ڈانٹتی پھٹکارتی اور گالیاں بکتی تھی۔ انہوں نے طوائفوں کی اس ناقص کارکردگی پر ان کی سرزنش کرنے کے لیے آدمی بھی ملازم رکھے ہوتے تھے۔''

(William Acton, Prostitution Considered In its Moral, Social, and Sanitary Aspects, Second Edition, 1870, P.10)

ٹالبوٹ نے چکلوں کی اندرونی صورتحال کے حوالے سے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے: ''ایک مرحوم سکول ماسٹر کی نوجوان بیٹی پر 15 / جون 1844ء بروز ہفتہ سنٹرل کریمنل کورٹ میں چوری کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس لڑکی کی ماں نے نو ماہ قبل

اسے لندن میں اپنی ایک سہیلی کے پاس رہنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اسے ہر ماہ گزارے کے لیے کچھ رقم بھیجا کرتی تھی۔ کوئی تین ماہ قبل اسے جانز پلیس، سٹور سٹریٹ، سیٹپنی میں واقع ایک چکلے والوں نے اپنے دام میں پھنسا لیا۔ چکلے کی مالکہ نے اسے گلیوں میں جا کر گاہک پھنسانے کا کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ تب اسے دروازے پر بیٹھ کر گاہکوں کو ورغلا کر اندر لانے کا کام سونپ دیا گیا۔ چونکہ اس کے پاس مناسب لباس نہیں تھا، اس لیے چکلے کی مالکہ نے اسے کپڑے ادھار پر دے دیئے۔ برے سلوک سے دوچار ہونے، نیم فاقہ کشی کی زندگی گزارتے ہوئے وہ اپنے طرزِ حیات سے نفرت کر کے وہاں سے نکل بھاگی۔ بھاگتے ہوئے وہ اپنے ساتھ چکلے کی مالکہ کے کپڑے بھی لے گئی تھی۔ وہ بری طرح بیمار تھی۔ چکلے میں رہائش کے دوران اس کی ساری کمائی پر چکلے کی مالکہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب چکلے کی مالکہ نے اس پر کپڑوں کی چوری کا مقدمہ درج کروایا ہوا تھا۔ بعدازاں قانون نے چکلوں کے لباس میں وہاں سے فرار ہونے والی لڑکیوں کو لباس کی چوری کا ذمہ دار ہونے سے آزاد قرار دیا تھا۔

رہائشی عمارتوں میں طوائفیں رہتی ہی نہیں ہیں بلکہ گلیوں میں گھوم پھر کر دھندہ کرنے والی طوائفیں بھی اپنے گاہکوں کو وہاں لا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ طوائف پرست مرد گلیوں میں گھومنے والی کسی طوائف سے سودا طے کر کے اسے وہاں لا سکتے ہیں۔

ایکٹن نے انیسویں صدی کے وسط میں لندن کے علاقے ایسٹ اینڈ میں واقع اسی قسم کے ایک چکلے کا ذکر یوں کیا ہے: ''ہم پہلے جس مکان میں داخل ہوئے وہاں طوائفیں رہا کرتی تھیں۔ اس مکان کی مالکہ ایک کالی، موٹی، خشک بالوں والی یہودن تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ بیوہ ہے۔ اس نے ایک عیسائی سے شادی کی تھی، جس پر اس کے ہم مذہبوں نے اسے برادری سے نکال دیا تھا...... ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ وہاں آٹھ کمرے تھے، جن میں آٹھ عورتیں کرائے پر رہتی تھیں۔ مکان مالکہ نے بتایا کہ ہر عورت اسے دو شلنگ فی گاہک ادا کرتی ہے اور جب کسی رات ہر

عورت دو دو مرد لاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتی ہے۔ مالکہ ہمارے ساتھ انسپکٹروں کو دیکھ کر محتاط ہو گئی تھی' اس لیے کہنے لگی کہ جب یہ عورتیں ''بدنصیبی'' سے دوچار ہوتی ہیں تو وہ ان کا خیال کرتی ہے۔ اس نے بتایا کہ دو عورتیں جب فارغ ہوں تو اکٹھی سوتی ہیں۔ تاہم ہر عورت اپنی کمائی اپنے پاس رکھتی ہے۔ جب وہ بیمار ہوتی ہیں تو ہسپتال سے رجوع کرتی ہیں اور سینٹ بارتھولومیو کا ہسپتال ان کا پسندیدہ ہسپتال لگتا ہے۔ اس مکان کو لندن کے علاقے ایسٹ اینڈ کا ایک چکلا کہا جا سکتا ہے۔''

اسی زمانے میں فیشن ایبل علاقے ویسٹ اینڈ کی صورتحال بہت مختلف تھی۔ بہتر درجے کی لڑکیاں جوا خانوں' خاص طور پر آرگل رومز میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ایکٹن لکھتا ہے: ''دروازوں سے گزر کر اندر داخل ہونے پر آپ خود کو ایسے وسیع وعریض کمروں میں پاتے ہیں' جو قیمتی ساز وسامان سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان کمروں میں گیس لیمپ روشن ہوتے ہیں' جن کے عکس ان گنت آئینوں میں جھلکتے ہیں۔ یہ منظر پرستان کا سا دکھائی دیتا ہے...... یہاں موجود تمام عورتیں بلاشبہ طوائفیں ہوتی ہیں' یہ طوائفیں خوبصورت' خوش لباس اور صحت مند ہوتی ہیں۔ انہوں نے فنکارانہ انداز میں زبردست میک اپ کیا ہوتا ہے...... وہ عموماً خاموش رہتی ہیں اور بہت کم گاہکوں کو مائل کرتی ہیں۔ تاہم ان کی ادائیں واضح طور پر فحش ہوتی ہیں...... ان میں سے ہر طوائف کا ممکنہ معاوضہ دو یا تین پونڈ ہوتا ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے گاہک انہیں جوا خانوں میں اپنے ہمراہ رکھیں گے اور رات کو شیمپین یا کسی اور قیمتی شراب کے ساتھ ان سے لذت اندوز ہوں گے۔''

اس قسم کے چکلوں کے علاوہ طوائفیں عام طور پر پبلک ہاؤسز اور سستے مکانوں کو استعمال کرتی ہیں۔ ٹالبوٹ کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ بندرگاہ پر واقع تقریباً ہر پبلک ہاؤس چکلہ ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''میں نے حال ہی میں چیتھم اور شیرنیس کا دورہ کیا اور پبلک ہاؤسز سے متصل لمبے کمروں میں بدقسمت عورتوں' ملاحوں اور فوجیوں کو دیکھا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پبلک ہاؤسز کے مالکان کی آمدنی کا انحصار زیادہ

تر انہیں پر ہے۔ گرین وچ ہسپتال کے لیفٹیننٹ ریورز اور لیفٹیننٹ مونٹوریننی نے مجھے بتایا کہ یہ یہاں کا معمول ہے کہ جب بحری جنگی جہاز بندرگاہ پر لنگرانداز ہوتے ہیں تو جسم فروش عورتیں ان پر سوار ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب یہ جنگی جہاز روانہ ہوتے ہیں تو یہ طوائفیں ان پر موجود رہتی ہیں اور بعض اوقات عورتوں کی تعداد جہاز پر موجود مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔"

(J.B.Talbot, The Miseries of Prostitutes, P.14)

شاید سب سے زیادہ بدنصیب طوائفیں وہ ہوتی ہیں' جن کے گاہک فوجی ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں انگلینڈ میں اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ چھاؤنیوں میں رہنے والی طوائفوں پر پولیس ضابطوں کا نفاذ کیا جائے۔ اس دوران جو انکشافات ہوئے ان سے نہایت افسوس ناک صورتحال سامنے آئی تھی۔ ان طوائفوں کی صورتحال تو پرانے زمانے میں لشکروں کے پیچھے پیچھے جانے والی طوائفوں سے بھی بری نکلی طوائفوں کا ایک زیادہ بدنام اجتماع آئرلینڈ میں کلڈر میں تھا۔ The Wren of the Curragh کے عنوان سے کسی نہ معلوم مصنفؒ کے لکھے ہوئے پمفلٹ میں بیان کردہ "بش ویمن" (Bushwomen) کہلانے والی کمیونٹی کی کہانی نہایت ہولناک ہے۔ ان طوائفوں کی تعداد ساٹھ تھی اور سب کی عمریں سترہ سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کی صورتحال نہایت رحم کے قابل تھی۔ وہ نوفٹ لمبی اور ساٹ فٹ چوڑی جھونپڑیوں میں رہتی تھیں' جنہیں درختوں کی شاخوں سے بنایا گیا تھا۔ ان کی اونچائی ساڑھے چار فٹ ہوتی تھی۔ انہیں "گھونسلے" کہا جاتا تھا اور یہ جھونپڑیاں لگتی بھی گھونسلے ہی تھیں۔ پمفلٹ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہ عورتیں کیمونزم پر عمل پیرا ہوں۔ "ان سب کی کمائی ایک عورت کے پاس جمع ہوتی ہے اور سب کے اخراجات اس رقم سے پورے کیے جاتے ہیں۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ سب ایک دوسری کے اچھے برے کی رفیق ہیں۔" تاہم تمام شواہد سے پتا چلتا ہے کہ انہیں برے حالات سے زیادہ دوچار رہنا پڑتا ہے۔ ان کی ابتر صورتحال ان کی کہانی کہہ رہی ہوتی ہے: "ان کا حال دیکھ کر سخت صدمہ ہوتا ہے --- یہ نظارہ بے امیدی و

بیچارگی سے معمور ہوتا ہے۔ ان کی صحت کمزور ہے۔ وہ سب ایک سا لباس پہنتی ہیں۔ سارا دن وہ نیم عریاں رہتی ہیں تاہم شام ہوتے ہی دلکش لباس پہن لیتی ہیں۔'' ان کے رویے سے انتہا درجے کی بے حیائی جھلکتی ہے۔ وہ ہر رات رنگ رلیوں اور بدمستیوں میں عملی طور پر حصہ لیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک رات کا احوال ملاحظہ ہو:

''دور سے آوازیں آ رہی تھیں' جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں اور چیخوں سے مجھے پتا چل گیا کہ یہ کوئی بدمستی سے بھری تقریب ہے۔ حقیقتاً وہ سب نشے میں بری طرح بدمست تھے۔ گہری تاریکی کے پردے کو چاک کرتی ہوئیں ان کی چیخیں' فحش گانے اور دل ہلا دینے والے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اب بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ شور مزید قریب آ گیا تھا اور انسان فحش گالیوں' غلیظ گانوں اور چیخوں کو زیادہ واضح طور پر سن سکتا تھا۔ مجھ پر تو اس شام نے لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہ کل پانچ تھیں اور دہلیزوں پر کھڑی اپنا آپ دکھا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بلی (Billy) کی ماں تھی۔ اس کی آواز سن کر اس کا بچہ جاگ گیا اور اسے پکارنے لگا۔ وہ اس جگہ کی سب سے زیادہ رحم کی قابل مخلوق تھی۔ وہ جلدی سے بچے کی طرف گئی اور اسے دودھ پلانے لگی۔ ہم نے ان سے سوال پوچھے۔ ان کی آمدنی کا پوچھا تو وہ اتنی کم بتائی گئی کہ ہمارے دل خون ہو گئے۔''

''دل پال مال گزٹ'' سے پتا چلتا ہے کہ 1880ء کی دہائی کے دوران لندن میں طوائفوں کی صورتحال بنیادی طور پر بہت کم تبدیل ہوئی تھی۔ ان انکشاف انگیز مضامین میں نہایت دردناک صورتحال بیان کی گئی ہے۔ ان میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ جسم فروش عورتوں کو چلانے والے لوگ زیادہ رقم کمانے کے لیے نوجوان لڑکیوں کو اپنے جسم بیچنے کے لیے ورغلاتے ہیں۔ ان لڑکیوں کو بعض اوقات

زبردستی دوشیزگی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ''دی پال مال گزٹ'' میں لکھا گیا ہے:
''میں نے اپنی تحقیق کے دوران سنا کہ جس لڑکی کی بربادی کا فیصلہ کر لیا جائے اس کا فرار ناممکن بنانے کے لیے سخت حفاظتی اقدامات کیے جاتے ہیں۔ میں نے لندن کے ایک فیشن ایبل مضافات میں رونما ہونے والا ایک واقعہ سنا' جس کی میں تصدیق کر سکتا تھا۔ یہ واقعہ لڑکیاں سپلائی کرنے والوں کی بے رحمی اور سنگدلی کو عیاں کرتا ہے۔
ایک دولت مند گاہک کو خوش کرنے کے لیے نائیکہ نے 15-14 سالہ ایک لڑکی کو بستر پر رسیوں سے بندھوا دیا تاکہ گاہک اس پر تشدد کر کے تسکین حاصل کرے' چیخیں روکنے کے لیے لڑکی کا منہ بھی بند کر دیا گیا تھا...... طوائفوں کو رسیوں سے باندھ کر ان پر تشدد کرنا لیورپول کی ہاف مون سٹریٹ اور ایناروزن برگ چکلے میں ایک معمول ہے۔''

بیشتر اوقات دوشیزگی کھو دینے والی لڑکی پیشہ ور طوائف بن جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنی مرضی سے دوشیزگی کھونے والی لڑکیاں اپنے والدین کے پاس واپس جانے کی جرأت نہیں کر سکتیں اور چکلوں ہی میں رہ جاتی ہیں۔ بعض لڑکیوں کو تو آخری وقت تک پتا نہیں لگنے دیا جاتا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ''دی پال مال گزٹ'' کا ایک مضمون نگار لکھتا ہے: ''میں نے ایک سابقہ نائیکہ سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی رضا سے اس دھندے میں آتی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ کچھ لڑکیاں اپنی رضا سے آتی ہیں جبکہ باقیوں کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ انہیں اس وقت تک کسی بات کا علم نہیں ہوتا جب تک کہ ''جنٹل مین'' بند کمرے میں ان کے بستر پر نہیں پہنچ جاتا اور پھر کوئی راستہ نہیں ہوتا' تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ میں اور میری لڑکیاں نئی لڑکی کو بہلا پھسلا کر رات کو دیر گئے تک روکے رکھتی ہیں۔ پھر انہیں نشہ آور دوا بہانے سے پلا دی جاتی ہے اور کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ''جنٹل مین'' کو اندر بھیج دیا جاتا ہے۔'' اس نائیکہ نے بتایا ایک جنٹل مین نے اس کے ساتھ پہلی ہمبستری کے لیے مجھے 13 پونڈ ادا کیے۔ جب اس نے یہ کام کیا وہ لڑکی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔

سچی بات یہ ہے کہ اسے نشہ آور دوا پلا دی گئی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔''

1880ء کی دہائی میں طوائف کی کم از کم عمر 13 سال مقرر تھی اور لندن کی گلیوں میں 13 سے 16 سال کی طوائفیں کثرت سے نظر آتی تھیں۔ اس سے پہلے 1875ء میں یہ عمر ناقابلِ یقین تھی یعنی صرف 12 سال۔ انیسویں صدی کے زمانۂ شر میں 12 اور 13 سال کی بچیاں اگر چاہیں تو اپنی دوشیزگی سے دست بردار ہو سکتی تھیں' جبکہ ان کی معصومیت کا استحصال کرنے والے مردوں کو کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ ''دی پال مال گزٹ'' میں ایسی کم عمر لڑکیوں کے ورغلائے جانے کے حوالے سے جو اعداد و شمار درج کیے گئے ہیں' وہ نہایت کرب انگیز صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں:

> ''ریسکیو سوسائٹی اکتیس سال سے معصوم لڑکیوں کو جسم فروش بننے سے بچانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ان کے پاس ایسی لڑکیوں کی عمروں کا پچیس سال پر محیط ریکارڈ موجود ہے' جنہیں طوائفیں بننے سے بچا لیا گیا تھا۔ 1862ء سے 1875ء کے درمیانی عرصے میں طوائف بننے سے بچا لی گئیں 12 اور 13 سال کی لڑکیوں کے فی سال اعداد و شمار بالترتیب ہیں: 33' 55' 65' 107' 102' 103' 77' 60' 78' 62' 40' 30'۔ گویا مجموعی طور پر 855 کم عمر لڑکیوں کو بچایا گیا۔ 12 سے 13 سال کی ان لڑکیوں کی اوسط فی سال تعداد 66 بنتی ہے۔ 1875ء سے 1883ء کے اعداد و شمار بالترتیب یہ ہیں: 22' 24' 19' 20' 16' 14' 15' 10' 7'۔ گویا مجموعی طور پر 147 کم عمر لڑکیوں کو طوائف بننے سے بچایا گیا۔ فی سال اوسط تعداد 16 بنتی ہے۔''

انگلینڈ میں موجودہ دور میں جسم فروشی کے ایسے اڈوں کی تعداد بہت کم ہے۔ واضح ہو کہ انیسویں صدی کے دوران ہی چکلوں کی تعداد میں نمایاں کمی دیکھی گئی تھی۔ 1885ء کے کریمنل لا امینڈمنٹ ایکٹ نے جسم فروشی کے ایسے اڈوں کا

صفایا کر دیا تھا۔ تاہم اس بات کو واضح طور پر جان لیا جانا چاہیے کہ چکلوں میں کمی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسم فروشی میں کمی آ گئی ہے۔ چکلوں میں کمی سے یہ نہیں ہوا کہ طوائفیں اپنا دھندہ جاری رکھنے سے قاصر ہو گئی ہوں۔ فرق بس اتنا پڑا ہے کہ وہ ایک چھت کے تلے کافی تعداد میں رہنے کی بجائے الگ الگ رہنے لگی ہیں۔ چکلے کی قانونی تعریف کے مطابق ایسی عمارت چکلہ ہوتی ہے جہاں کم از کم دو عورتیں جسم فروشی کے مقصد کے تحت رہتی ہوں۔

یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ بڑے شہروں میں طوائفوں کی طلب کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ لندن میں اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک کوونیٹ گارڈن میں طوائفوں کی کثرت ہوتی تھی۔ بعدازاں ہے مارکیٹ اور دوسرے مقامات مشہور ہو گئے' جو کہ حالیہ عشروں میں طوائفوں سے بالکل خالی ہوتے تھے۔ کسی نامعلوم مصنف نے Walere: My Secret Life کے عنوان سے ایک شہوانی آپ بیتی میں وکٹورین عہد کی طوائفوں کے حوالے سے بہت زیادہ معلومات درج کی ہیں۔ 1881ء میں دارالامراء کی ایک سلیکٹ کمیٹی کو ایک سینئر پولیس افسر نے بتایا کہ ''تین بجے سہ پہر سے ہی کسی معزز عورت کا ہے مارکیٹ سے گزر کر ولنگٹن سٹریٹ' سٹرینڈ تک جانا ناممکن ہے۔ سہ پہر تین یا چار بجے سے ویلیرز سٹریٹ' چیرنگ کراس سٹیشن اور سٹرینڈ طوائفوں سے بھر جاتے ہیں' جو کہ دن کے وقت لوگوں کو بھی کھلم کھلا جسم بیچتی نظر آتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے حساب لگایا گیا تھا کہ رات بارہ بجے کے بعد پکاڈلی سرکس اور واٹرلو پلیس کے درمیانی علاقے میں 500 طوائفیں موجود ہوتی ہیں۔''

گیارہواں باب

امریکہ میں جسم فروشی

امریکہ کے سرحدی شہروں کے حوالے سے کہانیاں اور حقائق پڑھنے والے سب لوگ ''گے لیڈیز'' (Gay Ladies) سے واقف ہیں' جو مغرب میں ہر دیہات اور کان کنوں کے ہر کیمپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس زمانے میں جن علاقوں میں غیر مہذب آدمی شراب نوشی کرتے اور لڑتے جھگڑتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے' ان علاقوں میں چند ایک ہی معزز عورتیں ہوتی تھیں۔ ان علاقوں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ تھی اور نتیجتاً اصناف کے اس عدم تناسب کی وجہ سے جسم فروشی نے دوسری کمیونٹیوں کے مقابلے میں یہاں بہت زیادہ فروغ پایا۔ یہاں قانون ضابطے کوئی نہیں ہوتے تھے اور جسم فروش عورتیں کھلم کھلا دھندہ کرتی تھیں۔

مشرق کے شہروں اور دیہاتوں میں صورتحال بہت مختلف اور کافی حد تک یورپ سے مشابہہ تھی۔ یہاں جسم فروشی کی کڑوی گولی پر کھانے کے قابل میٹھے کی تہہ چڑھانے کی کوششیں کی جاتی رہتی تھیں۔ مختلف ریاستوں میں صورتحال مختلف تھی تاہم جسم فروشی کو دبانے کی اکا دکا کوششوں کے علاوہ اس کو قابلِ برداشت تسلیم کر لیا گیا تھا اور بیشتر شہروں میں ''پارلر ہاؤسز'' کھلے ہوئے تھے جہاں جسم فروشی کا دھندہ ہوتا تھا۔

امریکہ کے ''پارلر ہاؤسز'' حقیقت میں چکلے ہوتے تھے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی اور درمیانی عشروں میں صرف اعلیٰ ترین درجے کے پارلر ہاؤس ہوا کرتے تھے۔ ان میں دھندہ کرنے والی لڑکیاں بہت خوبصورت' نہایت خوش لباس' تعلیم یافتہ

ہوتی تھیں۔ یہ پارلر ہاؤس بہت مہنگے ہوتے تھے اور منتخب لوگ ہی ان کے گاہک ہوتے تھے۔ تاہم رفتہ رفتہ ہر چکلے کو "پارلر ہاؤس" کہا جانے لگا اور بیسویں صدی کے آتے آتے طوائفوں کے معاوضوں میں فرق کی بنیاد پر پارلر ہاؤسز کی بھی قسمیں ہو گئیں۔ یوں فہرست میں سب سے اوپر دس یا بیس ڈالر والے چکلے تھے اور سب سے نیچے 50 سینٹ والے۔

چکلا کسی بھی قسم کا ہوتا' اصول ایک ہی ہوتا تھا۔ ایک پارلر ہاؤس میں انچارج عورت اور نوکروں کے علاوہ صرف طوائفیں رہتی تھیں' جن میں سے ہر ایک کا اپنا کمرا ہوتا تھا۔ تمام طوائفیں متعینہ وقت پر جمع ہو جاتی تھیں۔ اس وقت گاہک بھی جمع ہو جاتے تھے۔ یہ طوائفیں گاہکوں کی تلاش میں کبھی گلیوں میں نہیں پھرتی تھیں۔ گاہک خود ہی پارلر ہاؤس آتے اور اپنے لیے ساتھی کا انتخاب کر لیتے۔ تاہم پارلر ہاؤسز کے مالکان گاہکوں کو بہت سے مخش طریقوں سے متوجہ کرتے تھے۔ ان کے ایجنٹ کمیشن پر گاہک ڈھونڈتے تھے۔ ان میں ہوٹلوں کے پورٹر' شوفر' بارٹینڈر اور ایسے ہی دوسرے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے جنہیں مردوں سے ملنے کے معمول سے زیادہ مواقع دستیاب تھے۔ پارلر ہاؤس کی طوائفوں کا ہفتے میں ایک بار طبی معائنہ ہوا کرتا تھا۔ ہر طوائف کو جسم فروشی سے حاصل ہونے والی رقم کا عموماً 50 فیصد حصہ ملتا تھا۔ بعض چکلوں میں پیتل کے سکوں اور بعض میں پنچ کارڈ کا نظام رائج تھا۔

امریکی تہذیب کے ابتدائی زمانے میں طوائفیں امریکی نژاد ہوا کرتی تھیں' جو کہ اولین آبادکاروں کی اولاد تھیں۔ تاہم جب عظیم الشان امریکی جمہوریہ کی کشش دور و نزدیک پھیلی تو یورپ سے بیشمار لڑکیاں قسمت آزمائی کے لیے وہاں جانے لگیں اور یوں چکلوں میں غیر ملکی لڑکیوں کا اضافہ ہونے لگا۔ مقامی لڑکیوں کے مقابلے میں غیر ملکی لڑکیوں کو ورغلانا ہمیشہ زیادہ آسان رہا ہے۔ اس کے علاوہ چکلوں کے مالک اس امر کو اپنے لیے زیادہ محفوظ بھی پاتے ہیں کہ مقامی کی بجائے غیر ملکی لڑکیوں سے دھندا کروایا جائے۔ یہ برائی کے تاجر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اگر مقامی لڑکیوں سے جسم فروشی کروائی جائے تو حکومت' برائی کے خلاف کام کرنے والی سوسائٹیاں اور

عام لوگ شہروں کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیے زیادہ متحرک ہو جاتے ہیں جبکہ غیر ملکی لڑکیاں اس ظلم کا نشانہ بنیں تو ان کا ردِعمل زیادہ سخت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ چکلوں میں آنے والے مرد مقامی لڑکیوں کی نسبت دوسری قوموں کی لڑکیوں میں زیادہ کشش پاتے ہیں۔ یہ بات کرۂ ارض کے ہر ملک کے طوائف پرستوں پر صادق آتی ہے۔

ایک ایسی غیر ملکی لڑکی جرائم پیشہ لوگوں کا آسان شکار ہوتی ہے' جو کہ انگلش سے زیادہ واقف نہیں ہو اور اجنبی ملک کے طور طریقوں سے ناآشنا ہو۔ چکلوں کے مالک ایسی لڑکیوں سے لباس کی بہت زیادہ قیمتیں' طبی معائنے کی زیادہ فیسیں اور دیگر اشیاء کے دام بہت زیادہ وصول کرتے تھے۔ یہ سب رقوم طوائف لڑکی کے حساب میں درج کر لی جاتی تھیں اور اس کی آمدنی سے کاٹ لی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ ہمیشہ چکلوں کے مالکوں کی مقروض رہتی تھیں۔ ان لڑکیوں کو ڈرانا دھمکانا بھی آسان ہوتا تھا۔ وہ امریکی قانون سے بھی واقف نہیں ہوتی تھیں۔ چکلوں کے مالکان انہیں ڈرائے رکھتے تھے کہ فرار کی صورت میں انہیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جائے گا۔

بعض اوقات ان غیر ملکی لڑکیوں کو جسم فروشی کے لیے باقاعدہ طور پر درآمد کیا جاتا تھا۔ ایسی بیشتر لڑکیاں اپنے ملکوں میں پہلے ہی سے اس پیشے سے وابستہ ہوتی تھیں تاہم کچھ لڑکیوں کو زیادہ اجرتوں والے کاموں اور بہتر ملازمتوں کا جھانسا دے کر بھی امریکہ لایا جاتا تھا۔ 1909ء میں امریکی امیگریشن کمیشن نے ایک رپورٹ جاری کی تھی جس میں ایسا ہی ایک کیس درج تھا۔ ''شکاگو میں واقع ایک چکلے پر مارے گئے چھاپے میں ایک ایسی فرانسیسی لڑکی بھی بازیاب ہوئی ہے' جس کو 14 سال کی عمر میں امریکہ لایا گیا تھا۔ اس کو لانے والے نے اسے جھانسا دیا تھا کہ وہ ایک معزز عورت کی ملازمہ بنائی جائے گی اور اسے فرانس سے زیادہ اجرت ملے گی۔ اسے امریکہ لانے والے شخص نے اسے شکاگو کے ایک چکلے کو فروخت کر دیا تھا۔''

(Report on Importing Women For Immoral Purposes,

Washington, 1909, P.15)

بعض اوقات ان لڑکیوں کے درآمد کنندگان انہیں بیوی بنا کر امریکہ لے آتے تھے۔ اس کے علاوہ جرائم پیشہ لوگ اپنی رشتے دار لڑکیوں کو بھی امریکہ لا کر چکلوں کو فروخت کر دیتے تھے۔ اکثر جاپانی لڑکیوں کی شادیاں ان کے ملک کی روایت کے مطابق مرد کی غیر موجودگی میں کر دی جاتی تھیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے امریکہ آتی تھیں لیکن جسم فروشوں کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں۔

تاہم چکلوں میں لائی جانے والی تمام لڑکیوں کو درآمد نہیں کیا گیا ہوتا تھا۔ عورتوں کے تاجر اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ یورپ کے ہر حصے سے امریکہ میں سیلاب کی طرح آنے والے تارکین وطن میں سے جسم فروشی کے لیے موزوں لڑکیوں کو اچک لینا بہت آسان ہے۔ شکاگو کے ڈسٹرکٹ اٹارنی ایڈون ڈبلیو سمز نے محولہ بالا رپورٹ میں اس حوالے سے انکشاف کرتے ہوئے کہا:

> اس گندی تجارت میں ملوث لوگ کینیڈا میں ان مقامات پر موجود ہوتے ہیں' جہاں بہتر کام کی تلاش میں نکلنے والے تارکین وطن آ کر ٹھہرتے ہیں۔ انسانوں کے یہ شکاری تارکین وطن کے ہجوم میں ایسی لڑکیوں کو تاڑتے ہیں جن کے ساتھ ماں' باپ' بھائی یا کوئی دوسرا رشتے دار نہ ہو۔ ایسی کوئی لڑکی نظر آ جاتی تو ایک شخص اس کے پاس جاتا اور اس کی زبان میں اس سے ہم کلام ہوتا۔ جلد ہی وہ اسے اچھی اجرت پر ملازمت کی پیشکش کر دیتا۔ وہ اسے اپنے خرچ پر منزل تک لے جانے کی پیشکش بھی کرتا۔ جن کاموں کی پیشکش کی جاتی تھی ان میں زیادہ تر لانڈری' گھر' مٹھائی کی دکان یا کسی فیکٹری کی ملازمت شامل ہوتی تھی۔ شکاری کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ لڑکی کو اکیلا اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کے بعد واحد کام اس کی تباہی کے مختصر ترین راستے پر تیزی سے نکل پڑنا ہوتا تھا۔ جب

وہ زیادہ پیسوں' اچھے کپڑوں اور شادی وغیرہ کے جھوٹے وعدوں کے باوجود جال میں نہ پھنستی تو پھر سخت ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات شکاری اپنے شکار سے سچ مچ شادی کر لیتے تھے۔ اکثر اوقات شکار کی مزاحمت کم کرنے کے لیے نشہ آور دوائیں استعمال کی جاتی تھیں۔ جبکہ بعض اوقات بہت زیادہ تشدد سے بھی کام لیا جاتا تھا۔"

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ خوبصورت لڑکیوں کی قیمتیں بھی بہت زیادہ ادا کی جاتی تھیں۔ فرانس سے امریکہ لائی گئی طوائف کی قیمت عموماً 500 ڈالر ہوتی تھی۔ جسم فروش کا دھندا نہ کرنے والی معصوم نوجوان لڑکیوں کو اس سے بھی زیادہ قیمت ادا کر کے خرید لیا جاتا تھا۔ 1908ء میں شکاگو میں واقع چکلے ڈوفر ہاؤس میں چھاپے میں جو دستاویزات برآمد ہوئیں' ان سے پتا چلا کہ چکلے کے مالک ڈوفر نے ایک غیر معمولی حد تک خوبصورت لڑکی کے 1000 ڈالر ادا کیے تھے۔ سیٹل میں جاپانی لڑکیاں چار چار سو ڈالر میں خریدی گئیں۔ چینی لڑکیاں' جن کو درآمد کرنا زیادہ مشکل تھا' دو سے تین ہزار ڈالر فی لڑکی کے حساب سے خریدی گئی تھیں۔

یہ سچ ہے کہ بہت سی ریاستوں میں پارلر ہاؤسز یا چکلوں پر پابندی تھی' تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ قانون ان کو ختم کرنے سے لاچار تھا۔ مقامی حکام نے عورتوں کی تجارت کرنے والوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں جبکہ عام لوگ اس پرانی رائے کے تحت حکام کی تائید کرتے تھے کہ چکلے نہیں ہوں گے تو معزز عورتوں سے زنا بالجبر کیے جانے کے خطرات زیادہ ہوں گے۔ جہاں تک پولیس کا تعلق تھا تو جرائم پیشہ لوگ اسے رشوت دے کر خاموش کرا دیتے تھے۔

تاہم جسم فروشی کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے کوئی مستقل طریقہ نہیں تھا۔ مستقل رویہ صرف یہ تھا کہ اس برائی کو برداشت کیا جائے۔ کچھ شہروں میں طوائفوں کو الگ تھلگ واقع "ریڈ لائٹ" علاقوں تک محدود کر دیا گیا تھا اور ان کے طبی معائنے کا نظام بھی موجود تھا۔ تاہم دوسرے شہروں میں طوائفوں کو عام آبادی سے

الگ رکھنے یا ان کا طبی معائنہ کروانے کا کوئی قانون نہیں تھا۔

امریکہ میں جسم فروشی 1870ء میں عروج کو پہنچ گئی اور بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک پوری آب وتاب کے ساتھ موجود رہی۔ خاص طور پر شکاگو میں اس عرصے کے دوران جسم فروشی عام رہی۔ ساؤتھ سٹریٹ' ساؤتھ ڈیئربورن سٹریٹ اور دوسرے ایسے ہی علاقوں میں ہر قسم اور درجے کے چکلوں کی بہتات تھی۔ جس زمانے میں شکاگو میں پہلا ورلڈ فیئر منعقد ہوا تھا' ایک سابق سراغرساں کلفٹن آر۔وڈرج نے اس زمانے کے کسٹم ہاؤس پلیس (جسے بعد ازاں فیڈرل سٹریٹ کا نام دے دیا گیا تھا) کے بارے میں لکھا:

> ''یہاں سارا دن نیم عریاں عورتیں' فحش زبان بولتی ہوئیں' کھڑکیوں میں بیٹھی اپنی نمائش کرتی رہتی ہیں ...... یہاں بیک وقت 50 سے لے کر 100 تک عورتیں کھڑکیوں میں بیٹھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس علاقے میں ہر قومیت کی عورت رہتی ہے' جن میں سفید فام اور سیاہ فام عورتیں شامل ہیں۔ ان کی عمریں 18 سے 50 سال کے درمیان ہوتی ہیں۔ ان مکانوں میں زندگی کا ہر ایسا پست اور غیر اخلاقی منظر دیکھا جا سکتا ہے جس کا کہ انسانی ذہن تصور کر سکتا ہے۔''

ان چکلوں سے بہت زیادہ منافعے کمائے جاتے تھے' بالخصوص اونچے درجے کے چکلوں سے۔ ساؤتھ کلارک سٹریٹ میں واقع ایک اونچے درجے کے چکلے کی بدنام زمانہ مالکہ کیری واٹسن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس چکلے سے بے پناہ منافع کماتی تھی۔ پچیس سال چکلہ چلانے کے بعد اس نے یہ دھندا چھوڑ دیا اور ایک دولت مند عورت کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگی۔ ساؤتھ ڈیئر بورن میں کرسٹوفر کولمبس کریب اور لزی ایلن نے ایک چکلہ کھولا تھا۔ بعدازاں مشہورِ زمانہ ایورلی سسٹرز اس کی مالک بن گئیں اور اسے ایورلی کلب کہا جانے لگا۔ اس چکلے کو ''امریکہ بلکہ دنیا کا سب سے زیادہ بدنام' سب سے زیادہ مہنگا اور سب سے زیادہ

منافع بخش چکلہ" کہا جاتا تھا۔

(Herbert Asbury, The Underworld of Chicago, Robert Hale London, 1941, P.243)

ہربرٹ ایسبری لکھتا ہے کہ شکاگو میں وینا فیلڈز کا چکلہ بھی بیحد کامیاب تھا۔ یہ اپنے دور کا سب سے بڑا چکلہ تھا۔ وینا نظم و ضبط کی سخت ضرور تھی لیکن اپنی لڑکیوں کا بہت خیال رکھتی تھی: "وہ شکاگو کی کسی اور میڈم کے مقابلے میں انہیں ان کی آمدنی میں سے سب سے زیادہ حصہ دیا کرتی تھی۔"

چکلوں کے علاوہ سیلون بھی ہوتے تھے' جہاں پیشہ ور لڑکیاں گاہک پھانستی تھیں۔ طوائفیں گلیوں سے بھی گاہک پھانس کر وہاں لایا کرتی تھیں۔ بہت زیادہ مشہور تھے "ریزلا' ہوٹل' جو کہ چکلوں سے قدرے بہتر ہوتے تھے۔ ایسے ہوٹل کم از کم دس خواب گاہوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ انہیں اتوار کو شراب بیچنے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ ان ہوٹلوں میں زیادہ تر طوائفیں رہا کرتی تھیں۔

تاہم رفتہ رفتہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عوام اس برائی کے کھلے عام فروغ پر مشتعل ہونے لگے۔ نام نہاد "سفید فام غلاموں" کی تجارت کے حوالے سے سنسنی خیز جھوٹی سچی کہانیوں کے پھیلنے سے بدنام زمانہ مان ایکٹ منظور ہوا' جو 1910ء میں قانون بن گیا۔ اس قانون کے تحت لڑکیوں کا ملک کی ایک بندرگاہ سے دوسری تک لے جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جسم فروشی کے لیے کسی لڑکی کو کسی دوسری ریاست میں لے جانا ایک فوجداری جرم قرار دیا گیا اور اس کی سزا قید یا جرمانہ مقرر کی گئی۔ لڑکی مرضی سے جاتی یا زبردستی لے جائی جا رہی ہوتی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس قانون میں بہت خامیاں تھیں اور اس پر سخت تنقید کی گئی۔ اس قانون کو بلیک میل کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا اور چونکہ معاملے میں ملوث لڑکی پر مقدمہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اس رعایت کو بلیک میلنگ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

تاہم عورتوں کے تاجروں کو 1919ء میں منظور ہونے والے والسٹیڈ ایکٹ

سے کاری ضرب لگی۔ اس ایکٹ کے تحت پرانے ''پارلر ہاؤسز'' کی جگہ کھلنے والے سیلونوں اور شراب خانوں وغیرہ کو بند کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح پولیس نے گلیوں میں دھندا کرنے والی طوائفوں پر اتنی سختی کی کہ ان کا کام کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس سختی کے نتیجے میں زیادہ تر طوائفیں گلیوں سے چلی گئیں' جو بچ گئیں انہیں کام کو چلانے کے لیے بھاری رشوتیں دینا پڑتی تھیں۔

بارہواں باب

مشرقی ممالک میں جسم فروشی

تقریباً ایک صدی پہلے فرانس' ایل ہاکس نے درج ذیل اہم بات لکھی تھی:

''جاپانی معاشرے کی ایک خصوصیت ایسی ہے' جس نے اس قوم کو دوسری سب اقوام پر فوقیت دلا دی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جاپان میں عورت کے ساتھ غلام نہیں بلکہ ایک رفیق کا سا برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر ملک کی طرح یہاں بھی جسم فروشی ہوتی ہے مگر جاپانی طوائفوں کی تعریف کی جانی چاہیے کہ وہ بہت زیادہ پست اور فحش طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔''

(Francis L.Hawks, Narrative of the Expedition of An American Squadron to The China Seas And Japan, 1865, P. 462).

جاپان میں طوائفوں کے ساتھ بھی دوستانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ بلاشبہ کرۂ ارض پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے کہ جہاں طوائفوں کو ویسی عزت دی جاتی ہو' جیسی کہ جاپان میں دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانی بھی یورپیوں اور امریکیوں کی طرح یقین رکھتے تھے کہ طوائفیں تہذیب یافتہ زندگی میں نہایت ضروری مقام رکھتی ہیں' تاہم انہوں نے اس حقیقت پر یقین رکھتے ہوئے طوائفوں کو معاشرے سے الگ تھلگ نہیں کیا بلکہ کمیونٹی کی زندگی میں ایک اہم مقام دیا۔ حکومت اور عوام کے اس رویئے کی وجہ سے کسی جاپانی لڑکی کے لیے یہ ایک معمول کی بات ہے کہ وہ کسی دوسری طرح کے کام کی طرح جسم فروشی کو اختیار کر لے۔ اس کے نزدیک یہ روزی

کمانے کا صرف ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی رویے کی وجہ سے جاپان میں شاید دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عارضی طوائفیں ہیں۔ طوائف ہونے سے لڑکی کو شادی کرنے یا کوئی دوسرا کام اختیار کرنے یا گھر واپسی میں کبھی کوئی دشوار نہیں رہی ہے۔ چکلے کبھی ڈھکے چھپے نہیں تھے بلکہ مہنگے اور معززانہ ہوٹل ہوتے تھے۔

(Leslie W. Johns, Japan, Reminiscences and Realities, Stanley Paul, London, n.d, P.134)

مرد بھی یہاں ایسے کھلم کھلا جاتے جیسے کسی ریستوان یا تھیٹر میں جا رہے ہوں۔ اس ضمن میں جانز لکھتا ہے: ''میں ایک جاپانی بزنس مین سے ملنے اس کے دفتر گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ چکلے گیا ہوا ہے اور اگر میں چاہوں تو وہاں جا کر اس سے مل سکتا ہوں۔''

جاپان میں کئی صدیوں سے جسم فروشی کا باقاعدہ نظام قائم ہے۔ اویے ٹاڈا فوسا اور دوسرے تاریخ نگاروں کے ہاں حوالے ملتے ہیں کہ قدیم زمانوں میں بھی یہ نظام موجود تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ چکلوں کو شہر کے ایک خاص علاقے میں محدود کر دیا جاتا تھا۔ کیمفر نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ سترہویں صدی میں ناگاساکی کے تمام چکلے شہر کے ایک حصے میں دو گلیوں میں واقع تھے۔ یہ مؤرخ لکھتا ہے: ''لڑکیوں کو کمسنی ہی میں ان کے والدین سے خرید لیا جاتا ہے۔ قیمت لڑکی کی خوبصورتی اور جسم فروشی کے عرصے کے مدِنظر طے ہوتی ہے۔ ایک چکلے میں سات سے لے کر تیس تک طوائفیں ہوتی ہیں۔ انہیں نہایت عمدہ گھروں میں رکھا جاتا ہے اور رقص کرنے' گانا گانے' مختلف ساز بجانے' خطوط لکھنے اور طوائف کی زندگی کے سب طور اطوار سکھائے جاتے تھے۔ پرانی طوائفیں ان فنون اور اطوار کی ماہر ہونے کی وجہ سے نوجوان طوائفوں کی تربیت کرتی تھیں اور اپنی باری آنے پر وہ یہ فریضہ ادا کرتیں۔ جو لڑکی سیکھنے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی اُسے انعامات دیئے جاتے تھے۔ ایک طوائف کا ایک رات کا معاوضہ اچھا خاصا ہوتا تھا لیکن اس سے زیادہ مانگنے پر اُسے سزا دی جایا کرتی تھی۔ جو طوائف بہت زیادہ استعمال ہو چکی ہوتی ہے وہ دروازے کے ساتھ

ایک چھوٹے سے کمرے میں گاہکوں کا انتظار کرتی ہے اور گاہک مل جائے تو بہت تھوڑا معاوضہ پاتی ہے۔ جو طوائفیں اپنی مدت گزار چکی ہوتی ہیں وہ شادی کر کے شریف عورتوں کی طرح عام لوگوں میں گھل مل جاتی ہیں۔''

(E.Kaempfer, History of Japan, 1727)

کیمفر لکھتا ہے کہ مذہبی پیشوا بھی جسم فروشی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور معبد چکلوں سے کچھ ہی بہتر ہوتے تھے۔ ہمبرٹ لکھتا ہے کہ ایک زمانے میں معبدوں میں کنیزوں کی تصویریں ایسے ہی آویزاں ہوتی تھیں جیسے آج کل تھیٹروں اور سینماؤں میں اداکاراؤں کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں۔

چائے خانے ہمیشہ جاپانی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے ہیں۔ کیمفر لکھتا ہے کہ ان چائے خانوں میں بیشمار خوبصورت لڑکیاں ہوتی تھیں' جو کہ درحقیقت طوائفیں ہوتی تھیں۔ وہ کھلم کھلا گاہکوں سے مول تول کر رہی ہوتی تھیں۔ گزرگاہوں پر واقع سراؤں میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ یہ لڑکیاں نہایت ترغیب آمیز لباس پہن کر اور خوب میک اپ کر کے سرائے یا چائے خانے کے دروازوں پر کھڑی ہو جاتیں یا نزدیک ہی پڑے بینچ پر بیٹھ جاتیں اور آنے والے مردوں کو دلکش مسکراہٹوں سے نوازتی تھیں۔ جہاں دو سرائیں قریب قریب ہوتیں' وہاں ان لڑکیوں کی رقابت نمایاں نظر آتی تھی۔ کیمفر لکھتا ہے کہ اکاساکی اور گوئے نامی شہروں میں طوائفوں کی رقابت زیادہ عیاں تھی کیونکہ یہاں چکلے زیادہ تھے۔ ہر چکلے میں تین' چھ یا سات طوائفیں ہوتی تھیں۔ جو مسافر بھی یہاں سے گزرتا وہ طوائفوں سے ضرور فیض یاب ہوتا تھا۔ بعض اوقات کسی سرائے میں گاہک زیادہ ہوتے اور طوائفیں کم پڑ جاتیں تو ہمسائے میں واقع سرائے ہنسی خوشی اپنی کچھ طوائفیں عاریتاً مہیا کر دیتی تھی۔ شرط صرف یہ ہوتی کہ کہ ان کی ساری کمائی دیانتداری سے انہی کو دے دی جائے۔ یہ کوئی نئی رسم نہیں تھی۔ درحقیقت یہ بہت پرانی رسم تھی اور کئی سو سال پہلے اولین سیکولر بادشاہ اور جرنیل جوری ٹومو کے دور میں شروع ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ کہیں اس کی طویل فوجی مہمات کے دوران فوجی اپنی بیویوں اور بچوں کی یاد ستانے پر فوج سے بھاگ نہ جائیں۔ اس

نے یہ سوچ مدنظر رکھتے ہوئے سرکاری اور نجی چکلوں کے قیام کی اجازت دی اور انہیں طوائفوں میں مشغول کروا دیا۔

چائے خانوں میں طوائفوں اور ان کے گاہکوں کے مابین سودا بازی ہوتی تھی۔ ان چائے خانوں کو ہیکیٹی جایا کہا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ایک کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جب گاہک آتا تو بعض اوقات خود چائے خانے کی مالکہ اس کا خیرمقدم دروازے پر آ کر کرتی تھی۔ وہ اسے اندر لے جاتی اور پوچھتی کہ اس کے ذہن میں کونسا خاص چکلہ تھا۔ گاہک کسی خاص لڑکی کا نام بتاتا جس میں وہ ترجیحاً ملنا چاہتا تھا۔ جب یہ نکات طے ہو جاتے تو خادمہ اسے چکلے میں لے جاتی جہاں وہ ضروری بات چیت کرتی۔ اس کے بعد محفل ناؤنوش ہوتی' جو کہ اس تقریباتی عمل کا لازمی حصہ تھی۔ اس دوران خادمہ گاہک کی منتظر رہتی۔ آخرِ کار وہ اسے خواب گاہ تک لے جاتی' جہاں وہ اس وقت تک رہتی جب تک گاہک کی ''لیڈی فرینڈ'' نہ پہنچ جاتی۔ اس کے آنے پر خادمہ وہاں سے چلی جاتی تھی۔

بعض طوائفیں ایسی ہوتی تھیں جنہیں شیرخواری کی عمر ہی میں چکلوں کے مالکوں نے ان کے والدین سے خرید لیا ہوتا تھا اور اپنی غرض کے لیے انہیں پڑھایا اور تربیت دلائی ہوتی تھی۔ بعض لڑکیاں ایک مخصوص مدت کے لیے طوائف بن جاتی تھی اور اس کی قیمت وصول کرتی تھیں۔ مے ہیو نے جسم فروشی کے حوالے سے لکھی گئی اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے: ''کچھ والدین اپنی بیٹیوں کو جسم فروشی کی تربیت دلواتے تھے۔ ایسی لڑکیاں کچھ عرصے تک طوائف رہتی تھیں اور بعدازاں دوبارہ معمول کی زندگی میں لوٹ آتی تھیں۔ جن گھروں میں لڑکیاں جسم فروشی کرتی تھیں' وہ موسیقی سے گونجتے رہتے تھے۔ ایک سیاح کو جیڈو میں بتایا گیا کہ یہاں ایک ایسا معبد ہے جہاں 600 عورتیں جسم فروشی کرتی ہیں۔ اتنی کثیر تعداد کے باوجود نوجوان گاہکوں کو رات کے وقت اس وجہ سے لوٹا دیا جاتا تھا کہ سب کمرے بھرے ہوتے تھے۔ گولوونن نے چکلوں والے علاقے کی گلیوں سے گزرتے ہوئے بیشمار لڑکیوں کو دروازوں پر کھڑے دیکھا۔ ان میں سے بعض بہت کم عمر تھیں۔ وہ اتنی خوبصورت

ہوتی تھیں کہ یورپ کے باشندوں کی نگاہوں کو بھی خیرہ کرتی تھیں۔"

(Henry Mayhew, London Labour and The London Poor, Griffin, Bohn & Co, London, 1862, P.139)

جب لڑکیاں خود طوائف بننے نہ آتیں یا ان کی تعداد چکلوں کے مالکان کی خواہش سے کم ہوتی تو وہ زیگن کی خدمات حاصل کرتیں۔ زیگن تفویض کردہ کام کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے پر تیار ہوتے تھے۔ وہ لڑکیوں کے حصول کے لیے اپنے گماشتوں کو دور دراز علاقوں میں بھیج دیتے۔ ان گماشتوں کو ہدایت کی گئی ہوتی تھی کہ لڑکیوں کو خرید لیا جائے یا منت سماجت سے لے آیا جائے اور اگر ناکامی ہو تو پھر جبر سے کام لیا جائے۔ وہ لڑکیوں کو لا کر مقفل کمروں میں کڑی نگرانی میں رکھتے اور پھر چکلوں کے مالکان کے حوالے کر دیتے۔ کتاب The Nightless City کا مصنف لکھتا ہے: "ان لوگوں کی بے رحمی اور سنگدلی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہر رات ان بے چاری لڑکیوں کو ننگا کر کے کوڑے مارا کرتے تھے۔ وہ ان ننگی لڑکیوں کے کپڑے رات کے وقت اپنے گدے کے نیچے چھپا دیتے تھے تا کہ وہ لڑکیاں فرار نہ ہو سکیں۔ چکلوں کے مالکان سے جب ان لڑکیوں کا سودا ہونا ہوتا تو انہیں کرائے پر لیے گئے اچھے کپڑے پہنا دیئے جاتے تھے تا کہ وہ بظاہر اچھی نظر آئیں اور انہیں زیادہ قیمت پر بیچا جا سکے۔ دونوں فریقوں میں اس طرح مول تول ہوتا جیسے مچھیرا اور کوئی گھریلو عورت مچھلیوں پر مول تول کرتے ہیں۔ زیگن کی کوشش ہوتی تھی کہ چکلے کے مالکان سے جتنا زیادہ رقم ممکن ہو اینٹھ لے جبکہ چکلے کے مالکان کم سے کم رقم میں سودا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔"

ان گماشتوں کی سرگرمیاں روکنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ 1792ء میں عورتوں کو بیچنے پر پابندی لگا دی گئی تاہم یہ سلسلہ کسی نہ کسی روپ میں 1872ء تک جاری رہا۔ چکلوں کو شہر کے خاص حصوں میں محدود رکھنے کا قانون سترہویں صدی کے شروع میں نافذ کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے جس شہر میں اس قانون پر عملدرآمد کروایا گیا وہ یڈو تھا۔ بدنام زمانہ یوشی وارا یعنی چکلوں والے علاقے وجود میں آئے

تھے۔ ہر شہر میں یوشی وارا ہوتا تھا' جو کہ امریکی شہر کے ''ریڈلائٹ'' علاقے کے مماثل ہوتا تھا۔

تاہم یوشی وارا کی کچھ خصوصیات ایسی تھیں جو کہ یورپ اور امریکہ کے چکلوں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اعلیٰ درجے کے یوشی وارا کی طوائفیں دوسرے ملکوں کے چکلوں میں بیٹھنے والی طوائفوں سے بہتر حالات میں رہتی تھیں۔ یہاں ہونے والے مول تول اور ابتدائی گفتگو میں مغربی دنیا کے چکلوں والی کاروباریت نہیں پائی جاتی تھی۔ تاہم یوشی وارا کی سب سے زیادہ بدنام خصوصیت طوائفوں کی ''پنجروں'' میں نمائش تھی۔ ان ''پنجروں'' کی لمبائی چوڑائی اور بناوٹ سے اس چکلے کے درجے کا اظہار ہوتا تھا' جس سے کہ وہ طوائفیں منسلک ہوتی تھیں۔ ابتدائی زمانے میں چکلوں کے پانچ درجے ہوتے تھے۔ سب سے سستی قسم کے چکلوں کے پنجرے اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ طوائفوں کو ان میں لیٹنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس اونچے اور کھلی سلاخوں والے پنجروں میں اعلیٰ درجے کی طوائفیں بند ہوتی تھیں۔ 1872ء سے چکلوں کی قسمیں تین ہو گئیں۔

دن کے وقت پنجرے خالی رہا کرتے تھے۔ رات ہوتے ہی بجی سنوری طوائفوں کو ان میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ایک طوائف اس وقت تک پنجرے میں بند رہتی جب تک کوئی گاہک اسے پسند نہ کر لیتا یا یہ واضح نہ ہو جاتا کہ اس رات کوئی گاہک آنے کی توقع نہیں۔

1899ء میں ان پنجروں پر پابندی لگا دی گئی۔ پابندی سے پہلے ''دی نائٹ لیس سٹی'' کے مصنف نے لکھا کہ ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ''نوجوان بجی سنوری طوائفوں کو ان پنجروں میں دیکھ کر بہک جاتے ہیں اور چکلوں میں آنے جانے لگتے ہیں۔'' تاہم یہ تو انسانی فطرت ہے جو نوجوانوں یا بالغوں کو چکلوں کی طرف لے جاتی ہے۔ محولہ بالا کتاب کا مصنف لکھتا ہے: ''پنجروں پر پابندی کا مطلب یہ ہو گا کہ لوگ اب سیدھے چکلوں میں جائیں گے۔''

طوائف کا رہن سہن اس درجے پر منحصر ہوتا ہے' جس سے وہ تعلق رکھتی ہو'

اس کے علاوہ جتنی رقم وہ چکلے کے مالکوں کو رہائش کے بدلے دے سکتی' اس پر بھی اچھی رہائش کا انحصار ہوتا تھا۔ یوشی وارا کی ''سٹار'' یعنی اعلیٰ درجے کی طوائفوں کے اپنے کمرے ہوتے تھے۔ کمتر درجے کی طوائفیں ایک بڑے کمرے میں اکٹھی رہتی سوتی تھیں اور جب ایسی کسی طوائف کا گاہک لگ جاتا تو وہ اسے ایک کوٹھڑی میں لے جاتی تھی۔ ایک نامعلوم مصنف اپنی کتاب ''نوٹس آن دی ہسٹری آف دی یوشی وارا آف یڈو'' میں لکھتا ہے کہ بعض پست ترین چکلے ایسے ہوتے تھے کہ جن میں رہنے والی سب طوائفیں ایک ہی کمرے میں اپنے گاہکوں کی ہوس پوری کرتی تھیں۔

''دی نائٹ لیس سٹی'' کا مصنف لکھتا ہے کہ اعلیٰ درجے کی طوائفیں مہنگے لباس پہنتیں اور ان کی ذاتی خادمائیں ہوتی تھیں۔ وہ ایک ناول سے اس درجے کی ایک طوائف کا احوال نقل کرتا ہے:

> ''اس کے لباس کی خوبصورتی بیان سے باہر تھی۔ اس نے ایک لمبا ریشمی لبادہ پہنا ہوا تھا۔ اس نے بالوں میں کچھوے کے خول سے بنائے گئے قیمتی کلپ لگائے ہوئے تھے۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے چہرے پر صرف ایک نظر ڈالنے والے کی جان گویا نکل جاتی ...... اس بیان سے اس کے گھر کی صفائی' فرنیچر کی باذوق سجاوٹ اور اس کی ذاتی دلکشی کا تصور بخوبی کیا جا سکتا ہے۔''

حکام وقتاً فوقتاً طوائفوں کے لباسوں کے حوالے سے قوانین نافذ کرتے رہتے تھے' جس کے نتیجے میں زرق برق لباسوں کی جگہ سادہ لباس استعمال ہونے لگے تھے۔ ''دی نائٹ لیس سٹی'' کا مصنف لکھتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں ''یہ وحشیانہ چمک دمک اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ کریپ' مخمل' منقش ساٹن' سادہ ساٹن' ہیبوئی وغیرہ کے ملبوسات عام استعمال ہونے لگے تھے۔ ہر طوائف اپنے ذوق کے مطابق ملبوسات کے رنگوں اور ڈیزائنوں کا انتخاب کرتی تھی اور سب کے لباس اس حوالے سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔'' اس زمانے میں ''کسی

طوائف کو چکلے میں اپنی حیثیت سے کمتر لباس پہننے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ تاہم موجودہ زمانے میں طوائفوں کو اپنی مرضی سے لباس پہننے کی اجازت دے دی گئی ہے۔''

بارہویں صدی کی مشہور ترین طوائفیں: یویوآف اکیڈا' جو کہ ٹائرا مونیموری کی داشتہ تھی۔ سنجیوآف ٹاگوشی' جو کہ ٹائرا شنگی ہیرا کی داشتہ تھی۔ ایسونوزینشی' جو کہ فیوجی وارا شنسی شوناگن کی داشتہ تھی۔ ان مشہور طوائفوں میں سے بہت سی کو قدیم یونان کی ہیتاریوں جیسی قدرومنزلت حاصل تھی اور انہیں بہت دلکش خطابات سے نوازا گیا تھا مثلاً ''پھولوں والا درہ'' — ''کلی'' — ''شام کی دھند'' — ''پھولوں والی گلی'' — ''چیری کا درخت'' — ''شام کا چہرا'' — ''ہزار بہاریں'' — ''سفید موتی'' وغیرہ وغیرہ۔ (The Nightless City)۔ اس کے علاوہ وہ جن چکلوں سے وابستہ ہوتی تھیں انہیں بھی ایسے ہی متاثر کن نام دیئے جاتے تھے مثلاً ''آٹھ جھنڈوں والا مکان'' — ''پھولوں والا مکان'' — ''دیر تک تازہ رہنے والے پھولوں والا مکان'' اور ''دس ہزار پھولوں والا مکان''۔

بعض کم درجے والی طوائفیں حماموں سے وابستہ ہوتی تھیں یہ حمام بھی حقیقت میں چکلے ہوتے تھے' حمام تو صرف ایک خوشنما نام ہوتا تھا۔ ان حماموں میں لڑکیاں یا نوجوان عورتیں مالشی ہوتی تھیں۔ یہ لڑکیاں بہت خوبصورت ہوتی تھیں اور باقاعدہ چکلوں میں بیٹھنے والی طوائفوں کی رقیب ہوتی تھیں۔

''دی نائٹ لیس سٹی'' کا مصنف لکھتا ہے کہ یوشی وارا کی سب سے کم درجے والی طوائفیں دروازے کے سامنے لیٹی راہگیروں کو گناہ کی دعوت دیتی رہتیں۔ کوئی گاہک لگ جاتا تو وہ انہیں اندر بلا کر دروازہ بند کر لیتیں۔ چند ہی منٹ بعد دروازہ کھل جاتا اور گاہک اپنی ہوس مٹا کر چلا جاتا۔ یہ سلسلہ ساری ساری رات جاری رہتا۔ گاہک وقفے وقفے سے آتے' معمولی سا معاوضہ ادا کرتے اور اپنی جنسی بھوک مٹا کر چلے جاتے۔

بیسویں صدی کے اوائلی عشروں میں یوشی وارا کی مقبولیت کم ہونا شروع ہو

گئی تھی۔ اس زوال کی کافی حد تک وجہ وہ پابندیاں تھیں جو طوائفوں پر لگا دی گئی تھیں۔ انہیں کھلی کھڑکیوں میں بیٹھ کر اپنا آپ دکھانے پر پابندی لگا دی گئی تھی، جس سے یوشی وارا کی مقبولیت پر کافی اثر پڑا۔ تاہم دوسرے ملکوں کی طرح جاپان میں بھی اس کی سب سے بڑی وجہ غیر پیشہ ور جسم فروش لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ تھا۔ موجودہ زمانے میں عمومی طور پر جسم فروشی پر سخت پابندیاں عائد ہیں۔ اب چکلوں پر پابندی ہے۔ پیشہ ور طوائفوں کو رجسٹریشن کروانی پڑتی ہے۔ جنسی بیماریوں میں مبتلا طوائفوں پر علاج لازمی کروانے کی پابندی عائد ہے۔ ٹوکیو کے یوشی وارا کچھ عرصہ پہلے ہی بند ہو چکے ہیں۔

مشرقِ قریب کے دوسرے ملکوں میں سنگاپور کے چکلے بہت بدنام ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی مالے سٹریٹ میں 500 چکلے تھے اور ہر چکلے میں آٹھ سے تیس تک طوائفیں دھندا کرتی تھیں۔ یہ طوائفیں چکلوں کی بالکونیوں میں کھڑی ہو کر اپنے جسموں کی نمائش کرتی تھیں۔ ''دی وائٹ سلیو مارکیٹ'' کے مصنفین لکھتے ہیں: ''سہ پہر تین بجے سے لے کر رات دس بجے تک بجی سنوری طوائفیں بالکونیوں میں بیٹھی کافی کی چسکیاں لیتے، سگریٹ پیتے ہوئے راہگیروں کو اندر آنے کے بلاوے دیتی رہتی ہیں۔''

(Mrs. Archibald Mackirdy and W.N.Willis, The White Slave Market, Stanley Paul, London, N.D, P.123)

یہاں ہر مشرقی ملک کی طوائف دکھائی دیتی ہے۔ سنگاپور آنے والا کوئی سیاح ایسا نہیں ہوتا، جو مالے سٹریٹ جا کر ہر قومیت کی ان ''شوویمن'' کو دیکھنے کا نہیں سوچتا ہو۔

قدیم چین میں جسم فروشی کو شرمناک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ طوائفوں کو قدیم یونان کی ہیتاریوں جیسی قدرومنزلت حاصل ہوتی تھی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چین میں طوائف کا یہ مقام، پڑوسی ملک جاپان کے برعکس، ختم ہوتا گیا اور زمانہ ایسا آیا کہ طوائفوں کو نفرت اور کراہت کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ مزید برآں ایسا شاذ ہی ہوتا کہ چکلوں میں کام کرنے والی طوائفیں معزز معاشرے میں دوبارہ شامل

ہو سکیں۔

چین میں عام چکلوں کے علاوہ ایک خاص قسم کے چکلے ہوتے تھے' جو کہ چین کی انفرادی خصوصیت تھے۔ یہ پھولوں والی کشتیاں ہوتی تھیں۔ خاص طور پر کینٹن کی پھولوں والی کشتیوں نے طوائف پرست مردوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

پرانے زمانوں یہ ایک آفاقی رسم ہوتی تھی کہ جو والدین اپنی بیٹیوں سے نجات پانے کے خواہش مند ہوتے تھے' وہ انہیں پیدا ہوتے ہی یا کمسنی میں چکلوں کے مالکان کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ چکلوں کے مالک ان لڑکیوں کو جسم فروشی کے فن (ART) کی ترغیب دیتے تھے۔ جاپان کی طرح جب چین میں بھی قابلِ فروخت یا عمومی طریقوں سے جسم فروشی پر آمادہ کر لی جانے والی لڑکیوں کی رسد کم ہو جاتی تو انہیں اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ یہ روایت صدیوں تک برقرار رہی۔ ایس۔ ویلز ولیمز کہتا ہے"......چین میں چکلے خشکی پر اور پانی پر ہر جگہ موجود ہیں۔ یہاں کسی لڑکی کو تنہا دوسری جگہ بھیجنے میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اغوا کر کے جہنم کے ان دروازوں میں نہ دھکیل دیا جائے۔"

(S.Wells Willians, The Middle Kingdom, Wiley of Putnam, Newyork, 1858, Vol iii, P.96)

ہانگ کانگ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ وہاں موجود چکلوں میں دھندا کرنے والی تمام طوائفیں کم عمر ہوتی ہیں۔ "انہیں تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں ہانگ کانگ لایا جاتا ہے اور ان کی دوشیزگی ختم کرنے کا بھاری معاوضہ وصول کیا جاتا ہے۔ یہ رقم چکلے کے مالک کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ کسی اعلیٰ درجے کے چینی چکلے میں چوبیس سال سے زیادہ عمر کی لڑکی کو بالکل بھی نہیں رکھا جاتا۔ اس عمر کو پہنچنے پر اگر ان کی شادی نہیں ہوگئی ہو تو ان کے والدین انہیں واپس لے جاتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ کیا گزرتی ہے' یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ شاید وہ ہیئر ڈریسر' گھریلو خادمہ یا کسی دوسرے چکلے میں طوائف بن جاتی ہوں۔"

(Corresponding Respecting The Alleged Exictence of Chinese Slavery in Hong Kong)

چکلوں میں دھندا کرنے والی طوائفوں کو شاذ ہی کوئی اجرت دی جاتی تھی۔ جن چکلوں میں انہیں کچھ اجرت دی بھی جاتی تھی' وہاں خوراک اور لباس کی مد میں ان کی ساری کمائی چھین لی جاتی تھی بلکہ انہیں ہمیشہ چکلے کے مالکوں کا مقروض رکھا جاتا تھا۔ یہ کہانی بہت ہی پرانی ہے اور ہر اس ملک میں پائی جاتی ہے جہاں چکلے پائے جاتے ہیں۔ 2 نومبر 1866ء کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے: ''ہانگ کانگ کے ہر چکلے میں عورتوں کی خریدوفروخت ہوتی ہے۔ انہیں جھانسا دے کر ہانگ کانگ لایا جاتا ہے اور چکلوں کے مالکان کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے اور اس بری طرح خوفزدہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ پولیس سے شکایت نہیں کرسکتیں۔ وہاں ان کا نہ کوئی رشتہ دار ہوتا ہے نہ دوست' جو کہ مدد کرے اور وہ اس غلیظ دھندے کی دلدل میں دھنس جاتی ہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے آقاؤں کے احکامات بجا لاتی ہیں۔ تاہم ایسے بھی واقعات ہوئے ہیں کہ جن میں کچھ لڑکیاں چکلوں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئیں اور انہوں نے خود کو پولیس کی حفاظت میں دے دیا۔ پولیس شواہد نہ ہونے کی وجہ سے چکلوں کے مالکان کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ لڑکیاں کھلی عدالت میں بیان دینے سے ڈرتی تھیں۔''

چکلوں کا انسپکٹر ولیم لنگ کہتا ہے: ''میں نے ایک مکان میں چھ لڑکیوں اور تین بچوں کو پایا۔ کمرا بہت چھوٹا تھا۔ کھڑکیوں میں دروازے نہیں تھے۔ مکان کے عقب میں ایک کمرے میں چار لڑکیاں تھیں۔ وہ سب اکٹھی ہوگئیں۔ وہ بہت خوفزدہ لگتی تھیں۔'' اس نے یہ بیان ایک عدالت میں دیا تھا۔ عدالت ہی کے روبرو لومنگ نامی ایک شخص نے بیان دیا کہ ''میں ایک جوہری اور گھڑی ساز ہوں۔ میں 70 ویلنگٹن سٹریٹ میں رہتا ہوں۔ میں یہاں تین چار سال سے رہ رہا ہوں۔ یہ میرے سامنے والے مکان میں رہتی ہے۔ وہ کچھ سال پہلی منزل پر رہ چکی ہے۔ میں نے اس کے مکان میں بہت سی لڑکیوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سٹیمر

کے ذریعے آتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ عورت لڑکیوں کو خریدتی اور بیچتی ہے۔ یہ انہیں مکاؤ بھیجتی ہے۔'' وانگ یاؤ نے بیان دیا: ''میری عمر انیس سال ہے۔ میں ٹانگ کون میں وانگ چن میں رہتی ہوں۔ میری اپنے شوہر کی دوسری بیوی کے ساتھ لڑائی ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے مدعا علیہ شزام کے ہاتھ 81 ڈالر میں بیچ دیا۔ یہ صرف چند دن پہلے کی بات ہے۔ شزام مجھے سٹیمر کے ذریعے ہانگ کانگ لے گئی۔ وہ مجھے اے نیونگ کے گھر لے گئی' جہاں میں اب تک رہی ہوں۔ مجھے دیکھنے بہت سے مرد اس گھر آئے تھے۔ وہ مجھے خریدنے کے لیے دیکھنے آتے تھے۔ مجھے نہیں علم کہ انہوں نے دوسری لڑکیوں کو بھی دیکھا تھا کہ نہیں۔''

ہانگ کانگ کے چکلوں میں چین کے علاوہ دوسری قومیتوں کی لڑکیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ ''دی وائٹ سلیو مارکیٹ'' کے مصنفوں کے بقول ''گیج سٹریٹ اور لینڈ ہرسٹ ٹیرس سے ہر سال سینکڑوں امریکی لڑکیاں گزرتی ہیں۔ اگر وہ وہاں رہ جاتی ہیں تو جب ان کا شباب رخصت ہو جاتا ہے اور وہ شراب اور منشیات کی عادی ہو جاتی ہیں تو ٹکن روڈ کا چینی علاقہ ان کی آخری منزل ہوتا ہے۔ اس علاقے میں تقریباً تین سو چکلے موجود ہیں اور ہر چکلے میں ہر رنگ' نسل اور عقیدے کی ایک درجن سے بیس تک بدقسمت لڑکیاں ہوتی ہیں۔''

چین میں گلیوں میں گھوم پھر کر جسم فروشی کرنے والی اور چکلوں میں دھندا کرنے والی طوائفوں کے طبی معائنے کا نظام کبھی رائج نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیماریاں عام تھیں۔

بہت سے مستند مصنفوں نے لکھا ہے کہ چین میں جسم فروشی کے پھیلاؤ میں افیون نوشی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اسی طرح جنسی کجرویاں بھی افیون نوشی کے سبب عام تھیں۔ لائبر مین لکھتا ہے کہ افیون کے عام ہونے سے پہلے ہم جنس پرستی بھی عام نہیں تھی۔ چین میں مشہور ہو گیا تھا کہ افیون شہوانی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کا کسی حد تک جواز بھی تھا کیونکہ یہ نشہ آور شے بلاشبہ جنسی بھوک کو بھڑکاتی ہے۔ تاہم اس کا نقصان یہ ہوتا تھا کہ افیون جنسی بھوک کو اتنا بھڑکا دیتی کہ نارمل طریقوں

سے اسے آسودہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ افیون نوش کجروی کا شکار ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں مردانہ جسم فروشی بہت عام تھی۔ جسم فروش لڑکے بہت مشہور ہوتے تھے۔

بعدازاں چینی حکام نے ہر قسم کی جسم فروشی کو محدود کرنے کے لیے اپنی تمام تر قوت استعمال کی۔ وہ اس دھندے کے کچھ نہایت گھناؤنے اعمال پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے مثلاً کم عمر لڑکیوں کا اغوا اور طوائفوں کی چکلوں میں ساری عمر غلامی۔ چنگ شہنشاہوں کے دور میں 1910ء میں جسم فروشی کے لیے بچوں کے اغوا پر پابندی کا فرمان جاری ہوا۔ قومی حکومت نے بچوں کی غلامی کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے۔

موجودہ زمانے میں ''سرخ چین'' میں جسم فروشی کے واقعات کے حوالے سے قابلِ اعتماد سرکاری اعداد و شمار کا حصول ناممکن ہے۔ تاہم شنگھائی اب برائی کا مترادف نہیں رہا جبکہ کمیونسٹ حکام شہوانیت دشمن ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔

چینی انقلاب کے فوری بعد ہونے والی اصلاحات کے تحت کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف جسم فروشی کے دھندے میں لانے پر پابندی لگا دی گئی۔ جسم فروشی کے لیے لائسنس لینا پڑتا ہے اور اسے صرف ایسی لڑکی کو دیا جاتا ہے جو خود اس خواہش کا اظہار کرے کہ وہ طوائف بننا چاہتی ہے۔ تاہم یہ قانون عملاً اتنا مؤثر نہیں ہے کیونکہ چکلوں کے مالکان لڑکی کا ایک فوٹو اور اس کا دستخط شدہ بیان جمع کروا کر لائسنس حاصل کر لیتے ہیں۔ اس بیان میں لڑکی طوائف بننے کی اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ چکلے کا مالک اس کے کہنے پر درخواست دے رہا ہے۔ ایسا بہت ممکن ہے کہ لڑکی خود طوائف بننا نہیں چاہتی ہو اور صرف اپنے والدین یا چکلے کے مالکان کے احکامات کی تعمیل کر رہی ہو۔

تیرھواں باب

جسم فروشی پر پابندیوں کی تاریخ

جسم فروشی کے دھندے کے آغاز کے زمانے ہی سے اسے مٹانے کی کوششیں وقتاً فوقتاً جاری رہی ہیں۔ ہر دور میں ایسے اخلاق پرست لوگ موجود رہے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اس معذرت خواہانہ دلیل سے متفق نہیں ہوتے کہ جسم فروشی ایک ناگزیر برائی ہے۔ جسم فروشی کے ان مخالفین نے اس دھندے کو ختم کروانے کی کوششیں ہر دور میں کی ہیں۔

بعض اوقات تشدد کے ذریعے اس دھندے کو ختم کروانے کی کوششیں کی گئیں۔ بعض اوقات طوائفوں کو شہروں یا ملکوں سے نکال دیا گیا۔ کبھی کبھی انہیں موت کی سزا بھی دی گئی۔

جسم فروشی کو ختم کرنے کی سب سے قدیم کوشش وہ تھی جس کے تحت روم میں ویلنٹائن اور تھیوڈوسیس نے چکلوں کو بند کروا دیا تھا۔ جسٹینین نے بھی ایسے ہی اقدامات کیے اور جسم فروشی سے وابستہ ہر فرد کو ملک سے نکال دیا۔ تاہم طوائفوں کے ساتھ نرمی برتتے ہوئے ان کی اصلاح کی راہیں نکالی گئیں اور ان کی شادیوں اور معززانہ زندگی میں واپسی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہٹا دیا گیا۔ جسٹینین کی بیوی ملکہ تھیوڈورا شادی کے وقت خود طوائف تھی اس لیے اس نے بادشاہ کے اصلاحی اقدامات کی بھرپور تائید کی اور بیمار طوائفوں کے لیے ایک شاندار شفاخانہ تعمیر کروایا۔

جسم فروشی کو ختم کرنے کی کوششوں کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ یہ دھندا ڈھکے

چھپے انداز میں ہونے لگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انضباطی کارروائی کے باوجود جسم فروشی آج بھی موجود ہے۔ گو اب اسے گوارا کرلیا گیا ہے۔

اولین عیسائیوں نے اس دھندے کو گوارا کیا تو چکلوں اور جسم فروشی نے کافی فروغ پایا۔ آخر چھٹی صدی عیسوی میں وسیگوتھوں کے ایک بادشاہ ریکرڈ نے حکم دیا کہ سب طوائفوں کو سو سو کوڑے مار کر شہر سے نکال دیا جائے۔ صرف اس انضباطی کوشش کے علاوہ پورے یورپ میں بعدازاں جسم فروشی پنپتی رہی۔ ہر جگہ حماموں اور دیگر خوشنما ناموں کے پردوں میں چکلے کھل گئے تھے۔ ننوں کی اکثر رہائش گاہیں اور خانقاہیں یا تو چکلے تھیں یا ان میں کھلم کھلا جنسی کجروی ہوتی تھی۔

بلاشبہ صدیوں تک یورپ کا تقریباً ہر شہر طوائفوں سے بھرا رہا۔ اس بات کو لازماً یاد رکھنا چاہیے کہ جسم فروشی قانون تھی، استثنا نہیں تھی۔ پیرس میں ہر قسم کی لاتعداد طوائفیں موجود تھیں۔ اسی طرح روم، لندن، وینس جیسے شہر بھی طوائفوں سے بھرے ہوتے تھے۔ سٹراسبرگ میں طوائفیں ہر چرچ میں کھلم کھلا جسم فروشی کرتی تھیں۔

فرانس کا بادشاہ لوئی نہم پہلا حکمران تھا، جس نے پیرس کو پورے یورپ میں بدنام کر دینے والی صورتحال کو تبدیل کرنے کی کوئی حقیقتاً مخلصانہ کوشش کی۔ 1245ء میں لوئی نے فرمان جاری کیا کہ تمام طوائفوں، چکلے چلانے والوں اور ہر دلال کو فرانس سے نکال دیا جائے۔ تاہم جیسا کہ اکثر ہوتا ہے یہ علاج بیماری سے بھی زیادہ برا نکلا۔ چکلوں میں جانے کے عادی مرد معزز عورتوں کی ورغلا کر اپنی ہوس مٹانے لگے۔ سینٹ آگسٹین کا پرانا مقولہ سچ ثابت ہوا کہ معزز عورتوں کی عصمتیں اس وقت تک ہی محفوظ ہو سکتی ہیں کہ جب تک مردوں کی جنسی بھوک مٹانے کے لیے پیشہ ور جسم فروشی کا سلسلہ جاری ہے۔ آخرِ کار دو سال بعد لوئی نے اپنا فرمان واپس لے لیا اور چکلے دوبارہ کھل گئے اور طوائفیں فرانس واپس آ گئیں۔ تاہم اس مرتبہ ان پر کچھ قوانین عائد کر دیئے گئے تھے۔ طوائفوں کو پیرس کے ایک مخصوص علاقے میں محدود کر دیا گیا۔ ان کے عریاں لباس پہننے پر پابندی لگا دی گئی اور ان پر نگرانی کے لیے ایک افسر کو متعین کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ لوئی نے رومن انداز میں ضابطے نافذ کرنے کی کوشش کی

تھی تاہم یہ عمل زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا اور بالآخر ان ضوابط کو ختم کر دیا گیا۔ لوئی کے جانشیں فلپ نے بھی جسم فروشی پر پابندی لگانے کی کوشش کی مگر وہ بھی زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔

وقتاً فوقتاً ایسی ہی کوششیں ہوتی رہیں۔ تاہم جیسا کہ میں پہلے نشاندہی کر چکا ہوں' آتشک کے تیزی سے پھیلنے سے پہلے حقیقتاً کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ آتشک کے پھیلنے کا الزام طوائفوں پر لگایا گیا اور پورے یورپ میں طوائفوں سے نفرت پھیل گئی۔

کہا جاتا ہے کہ کولمبس کے ساتھ نئی دنیا جانے والے ملاح 1494ء میں سپین واپسی پر یورپ کے لیے آتشک کا تحفہ لے کر آئے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس سے پہلے یورپ میں اس بیماری کے نہ ہونے کا دعویٰ مشکوک ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ آتشک اور سوزاک (ان دونوں بیماریوں کو اس زمانے میں ایک ہی بیماری کی دو شکلیں سمجھا جاتا تھا) پندرہویں صدی میں ہی پورے یورپ میں پھیلی تھیں۔ جہاں کولمبس کے ملاحوں پر ان بیماریوں کو سپین درآمد کرنے کا الزام ہے' وہاں چکلوں کے مالک تمام مردوں میں ان کے پھیلاؤ کے ذمہ دار تھے۔ سولہویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے چکلوں اور طوائفوں پر حملے ہونے لگے۔

1560ء میں فرانس کے بادشاہ چارلس نہم نے پیرس کے چکلے بند کروا دیے اور طوائفوں اور ان سے متعلق ہر فرد کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ 1577ء میں اٹلی میں ہر طوائف اور چکلے کے مالک کو کیٹالینا سے نکل جانے کے لیے آٹھ دن کی مہلت دی گئی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی۔ سپین میں اگرچہ طوائفوں کو شہروں میں دھندا کرنے کی اجازت تو دی گئی تاہم انہیں پابند کیا گیا کہ وہ اپنا طبی معائنہ کروائیں۔ جو طوائف مذکورہ بیماریوں میں سے کسی میں مبتلا ہوتی اسے دھندہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

تاہم فطری طور پر ان اقدامات سے جسم فروشی ختم ہونا تو کجا اس میں کمی بھی نہیں آئی۔ ہوا صرف اتنا کہ طوائفیں اور ان کے گاہک زیادہ محتاط ہو گئے۔ جہاں

چکلے بند ہو گئے وہاں کھلم کھلا جسم فروشی کی بجائے پوشیدہ جسم فروشی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ جبروستم کے ساتھ اس کی اپنی برائیاں بھی نمودار ہوئیں۔ جسم فروشی کے خلاف بنائے گئے قوانین کو دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ مرد اپنی داشتاؤں اور کنیزوں پر پیشہ ور جسم فروشوں کا الزام لگا کر ان سے چھٹکارا پانے اور علاقے سے نکلوانے لگے۔

جسم فروشی پر پابندی کی صدیوں پر محیط کوششوں کا تفصیلی جائزہ غیر دلچسپ ثابت ہوگا۔ جبر کے ہر دور کے بعد جسم فروشی کو گوارا کرنے کا دور آیا۔ چنانچہ یورپ میں جسم فروشی کی تاریخ میں بے پناہ فحاشی کے فروغ کے درمیان اخلاق پرستی کے چھوٹے چھوٹے وقفے بھی آتے ہیں۔ کوڑے اور سزا کی زیادہ سفاکانہ صورتیں، جلاوطنی، قید — سب کو بار بار آزمایا گیا مگر سب ناکامی سے دوچار ہوگئے۔ نپولین کی جنگوں کے زمانے تک پورے یورپ میں عمومی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ اس دھندے کو ختم کرنے کی کوششیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

تاہم امریکہ اور انگلینڈ میں اخلاقی اور مذہبی عناصر نے جسم فروشی کو ختم کرنے کی کوششیں ترک نہیں کیں۔ 1891ء میں پٹسبرگ سے جسم فروشی کا صفایا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چکلے بند کر دیئے گئے۔ طوائفوں کو مالکان اور دلالوں نے خوراک اور لباس فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اقدامات ظالمانہ تھے تاہم یہ بھی کوئی مستقل اچھے اثرات پیدا کرنے میں ناکام ہو گئے۔ صرف یہ ہوا کہ طوائفیں کچھ وقت کے لیے دوسرے شہروں کو چلی گئیں۔

انگلینڈ میں انیسویں صدی کے دوران پورٹس ماؤتھ سے جسم فروشی کو ختم کرنے کی ایک کوشش کی گئی۔ ہیولاک ایلس نے اپنی مشہور کتاب Studies in The Psychology of Sex, Vol IV میں "متعدی امراض ایکٹ" کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے 1879ء میں بنائی گئی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے دیئے گئے ایک شخص کے بیان کا حوالہ دے کر پورٹس ماؤتھ والی کوشش کا نتیجہ بیان کیا ہے۔ 1860ء میں پورٹس ماؤتھ کے میئر نے شہر میں عام ہو جانے والی جسم فروشی پر قابو پانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے

300 سے 400 طوائفوں کو ان کی رہائش گاہوں سے نکلوا دیا اور وہ بے گھر ہو کر گلیوں میں آ گئیں۔ چکلوں والوں نے انہیں کھانا اور پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کئی دن تک گلیوں میں فاقے کاٹتی رہیں۔ کسی کو ان کی خواہش نہیں تھی۔ ان کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ آخر حکام نے انہیں ان کی رہائش گاہوں میں جانے اور اپنا دھندہ جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ جسم فروشی کو ختم کرنے کی کوشش بالکل ناکام ہو گئی تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ امریکہ اور انگلینڈ کے یہ تجربات جسم فروشی پر حقیقی پابندی کی آخری کوششیں تھے۔ ان کی ناکامی سے جسم فروشی کے مخالفوں میں تلخ ترین مایوسی پھیل گئی۔

یہ امر واضح ہو گیا تھا کہ نہ صرف جسم فروشی کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ایسی ہر کوشش کے نتیجے میں جسم فروشی جیسی ہی دوسری برائیاں پھیل جاتی ہیں۔ اخلاق و اصلاح پسند لوگ پابندی سے ضابطوں کے نفاذ کی طرف مائل ہو گئے۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ جس برائی کو ختم نہیں کیا جا سکتا' اسے قابو میں رکھا جائے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جسم فروشی کو ضابطوں کا پابند بنانے اور چکلوں کو لائسنس دینے کی ابتدا سولن کے زمانے میں ہوئی تھی اور یہ کہ یورپ کے مختلف شہروں میں چکلوں اور طوائفوں پر خاص ضابطے نافذ کیے گئے تھے۔ تاہم مذہبی جسم فروشی پر ضوابط کے نفاذ سے شروع ہونے والی ان کوششوں کا بڑا مقصد چرچ یا ریاست کے لیے رقوم کا حصول ہوتا تھا۔ تاہم اٹھارہویں صدی میں ضابطے نافذ کرنے کا بنیادی مقصد کمیونٹی کی صحت اور اخلاق کی بہتری تھا' جبکہ ٹیکسوں کی وصولی ثانوی مقصد تھا۔

آتشک کے پھیلاؤ کے بعد طوائفوں کے طبی معائنے کی نیم دلانہ کوششیں ہوئی تھیں تاہم ایسے اقدامات سنجیدگی سے نہیں کیے گئے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے تک اس حوالے سے کوئی وقیع کوششیں نہیں کی گئیں۔ 1724ء میں ایک انگریز ادیب برنارڈ مینڈوائل نے اپنے بدنام پمفلٹ A Modest Defence of Public Stews میں تجویز دی تھی کہ میڈیکل انسپکٹر چکلوں میں جا کر باقاعدگی سے طوائفوں کا طبی

معائنہ کریں۔ تاہم اس کی تجویز کو کوئی قبولیت نہیں ملی۔ پورے یورپ میں جسم فروشی فروغ پاتی رہی اور اس عرصے میں جنسی بیماریاں بھی تیزی سے پھیلتی رہیں۔ صدی کے اختتام پر انقلابِ فرانس اور اس کے بعد مسلسل ہونے والی جنگوں کی وجہ سے سوزاک اور آتشک بہت زیادہ پھیل گئے۔

فرانس میں طوائفوں کی رجسٹریشن کی پہلی کوشش 1778ء میں کی گئی' تاہم یہ نپولین تھا' جس نے اپنی شہرت اور اقتدار کے عروج پر' پیرس میں پہلی مرتبہ طوائفوں کے طبی معائنے کا باقاعدہ انتظام کیا۔ دراصل نظام تو 1802ء میں قائم کر دیا گیا تھا تاہم اس پر پوری طرح عمل 20 سال بعد کیا گیا اور پیرس کے تمام چکلوں میں بیٹھنے والی طوائفوں کا طبی معائنہ کیا جانے لگا۔ اس فرانسیسی قانون کا اطلاق پیرس کے علاوہ دیگر شہروں اور قصبوں پر نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ہر میونسپل حکومت کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے عوام کی صحت کی حفاظت کے انتظامات کرے۔ اسی وجہ سے مذکورہ ضابطے کا اطلاق ہر شہر اور قصبے پر نہیں کیا گیا۔

ایکٹن طوائفوں کی رجسٹریشن کے حوالے سے لکھتا ہے: ''ٹربیونل کو طوائف اپنا نام' عمر' جائے پیدائش' پیشہ اور ڈومیسائل بتاتی ہے۔ اس کے بعد اس سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یا کنواری؟ کیا اس کے ماں باپ زندہ ہیں؟ کیا وہ ان کے ساتھ رہتی ہے' اگر نہیں تو کیوں اور یہ کہ اس نے انہیں کب چھوڑا تھا؟ کیا اس کے بچے ہیں؟ وہ پیرس میں کب سے رہتی ہے؟ کیا وہ کبھی گرفتار ہوئی ہے' اگر ہوئی ہے تو اس حوالے سے کاغذات کہاں ہیں؟ کیا وہ پہلے طوائف رہی ہے؟ اگر ایسا ہے تو تفصیلات؟ کیا وہ تعلیم یافتہ ہے؟ کیا اسے کوئی جنسی بیماری ہے؟ اس نے جسم فروشی کس مقصد سے شروع کی تھی؟ ان سوالات کے بعد اس کا طبی معائنہ کیا جاتا اور اگر وہ بیمار ہوتی تو اسے سینٹ لازارے ہسپتال میں داخل کروا دیا جاتا۔ اس دوران اس کے دیئے گئے جوابات کی تصدیق کروائی جاتی۔ اس کے آبائی کمیون کے میئر سے رابطہ کیا جاتا کہ لڑکی کو اس کے والدین تک پہنچایا جائے۔''

(William Acton, Prostitution Considered in its Moral, Social and

Sanitary Aspects, PP. 103-4)

لائسنس یافتہ طوائف کو ایک کارڈ دیا جاتا تھا جس پر اس کا نام پتا اور رجسٹریشن نمبر درج ہوتے تھے۔ طبی معائنے کے نتائج لکھنے کے لیے بھی خالی جگہیں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات طوائفیں رضاکارانہ طور پر رجسٹریشن کروالیتی تھیں تاہم زیادہ تر حکومت جبراً ان کی رجسٹریشن کرتی تھی۔ غیر رجسٹر شدہ طوائفوں کو ہر وقت پولیس کی نگاہوں سے چھپتے رہنا پڑتا تھا۔

1946ء میں فرانس میں جسم فروشی کے حوالے سے نئے قوانین نافذ کیے گئے' جن کے تحت چکلوں پر پابندی لگا دی گئی۔ طوائفوں کو رجسٹریشن اور باقاعدہ وقفوں سے طبی معائنہ کروانے کی سخت ہدایات دی گئیں۔ تاہم ہر ایسے ملک میں جہاں اس طرح کے ضابطے نافذ ہیں غیر پیشہ ور طوائفوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ پولیس جبراً ایسی لڑکیوں کی رجسٹریشن نہ کرلے جو کہ صرف ''غیر پیشہ ور طوائف'' یا ''عارضی طوائف'' ہی رہنا چاہتی ہوں۔

انگلینڈ میں ضوابط کا ایک نظام قائم کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس حوالے سے سب سے پرانا قانون 1161ء میں پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا' جس کے تحت لندن میں چکلے قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ چکلے لندن میں چار سو سال تک قائم رہے۔ برطانوی رائے عامہ جسم فروشی پر ضابطوں کے نفاذ یا لائسنس جاری کرنے کے خلاف رہی ہے۔ برطانوی عوام کا خیال ہے کہ ایسا کرنا بدی کو جائز قرار دینے کے مترادف ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ انگریز عوام اور حکومت کے ایسے رویے کو منافقانہ قرار دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل منافقانہ ہی ہے۔ تاہم منافقت ہے یا نہیں انگریز عوام جسم فروشی کو لائسنس دینے اور طوائفوں کے طبی معائنے کے نظام کے خلاف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لائسنس کا نظام انگلینڈ میں بہت پہلے آزمایا جا چکا ہے۔

1862ء میں انگلینڈ کی بحریہ کے اعلیٰ افسروں نے فیصلہ کیا کہ پیدل فوج اور بحریہ میں جنسی بیماریوں اور طوائفوں پر ضابطوں کے نفاذ کے حوالے سے غور کرنے

کے لیے کمیٹی بنائی جائے۔ اس کمیٹی نے طوائفوں کے لازمی طبی معائنے کی تو مخالفت کی تاہم سفارش یہ کی گئی کہ ان کو طبی معائنے کروانے پر رضامند کیا جائے اور بیمار طوائفوں کا علاج کروایا جائے۔ تاہم عوام کو ان تفصیلات سے لاعلم رکھا گیا۔ 20/ جون 1864ء کو لارڈ کلیرنیس پیجیٹ نے بل پارلیمان میں پیش کیا۔ بحث کے دوران فوج اور بحریہ کے جوانوں میں پھیلی ہوئی جنسی بیماریوں کا حوالہ دیا گیا اور اسے متعدی امراض سے بچاؤ کے ایکٹ کا عنوان دیا گیا۔ بعدازاں اس پر ملک میں کافی تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا۔

اس ایکٹ میں طوائفوں کو طبی معائنہ کروانا لازم قرار دیا گیا تھا اور جنسی بیماری کی شکار طوائف کو تین ماہ کے لیے مقفل ہسپتال میں رکھنے کا اقدام منظور کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کا اطلاق پورٹس ماؤتھ' پلے ماؤتھ' وولوچ' چیتھم' شیرنیس' الیڈرشاٹ' کلوچیسٹر' شارن کلف' کارک اور کوئینز ٹاؤن کے فوجی شہروں پر ہوتا تھا۔ اس کے حامیوں کا خیال تھا کہ اسے تین سال تک آزمایا جانا چاہیے' دو سال بعد ایک اور ایکٹ منظور کیا گیا جس کا مقصد 1864ء والے ایکٹ کے غیر مؤثر ہونے کے بعد تسلسل برقرار رکھنا تھا۔ نئے ایکٹ میں طوائفوں کی رجسٹریشن بھی لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ اس ایکٹ کو مذکورہ بالا شہروں کے علاوہ ونڈسر پر بھی نافذ کیا گیا تھا۔ 1869ء میں ایک اور ایکٹ میں کینٹربری' ڈوور' گریوسینڈ' میڈسٹون' ونچسٹر اور ساؤتھمپٹن کو بھی شامل کر لیا گیا۔

ان قوانین پر عام پولیس عملدرآمد نہیں کرواتی تھی۔ جن شہروں پر ان کا اطلاق ہوتا تھا وہاں سادہ لباس والے خاص افسروں کا تقرر کیا گیا تھا۔ حقیقتاً وہ افسر پرائیویٹ سراغاں ہوتے تھے۔ ان کا فرض یہ تھا کہ ایسی عورتوں کو ڈھونڈیں جو پیشہ ورانہ جسم فروشی میں ملوث ہوں۔ ایسی جو عورت پائی جاتی اس کا نام پتا ایک خصوصی رجسٹر میں درج کر لیا جاتا تھا اور جب ایک دفعہ کسی عورت کا نام رجسٹر میں درج کر لیا جاتا اسے بغیر اجازت مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ طوائفوں کو باقاعدہ وقفوں کے ساتھ طبی معائنہ کروانے پر مجبور کیا جا سکے۔ چنانچہ رجسٹر میں درج

ہر طوائف پر لازم تھا کہ وہ ہر پندرہویں دن طبی معائنہ کروائے' بصورتِ دیگر اسے گرفتار کر کے جیل میں بھیجا جا سکتا تھا۔ جب تک رجسٹرڈ عورت صحت مند رہتی اسے اپنا دھندہ جاری رکھنے دیا جاتا لیکن اگر وہ کسی جنسی بیماری میں مبتلا پائی جاتی تو اسے ہسپتال پہنچا دیا جاتا جہاں اسے صحت یاب ہونے تک رکھا جاتا تھا۔

سادہ لباس والی خصوصی پولیس ایسی عورتوں کو تلاش کرتی رہتی تھی' جو پیشہ ور جسم فروشی کر رہی ہوں۔ ایسی عورتیں مل جاتیں تو انہیں ''رضا کارانہ اعتراف'' پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ اس فارم پر دستخط کرنے کا مطلب تھا کہ وہ عورت اپنے آپ کو طوائف تسلیم کرتی ہے نیز پندرہ روزہ طبی معائنے کے لیے خود کو پیش کرنے کا عہد کرتی ہے۔ دستخط کرنے کے بعد اس عہد سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا — حتیٰ کہ شادی کر لینے یا کوئی دوسرا معززانہ کام شروع کرنے کے باوجود وہ طبی معائنہ کروانے کی پابندی سے آزاد نہیں ہوتی تھی۔

ان قوانین سے ناانصافی کی راہ کھلی' جیسا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں سرکاری عہدے پر کام کرنے والے اصحاب بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے قوانین اکثر ناانصافیوں کا باعث بنتے ہیں۔ پولیس والے لڑکیوں اور عورتوں کو پکڑ کر لے آتے اور انہیں فارموں کے مندرجات سے آگاہ کیے بغیر ان سے دستخط کروا لیتے تھے۔ اس زمانے میں دیہاتی اور گھروں میں کرنے والی عورتیں غیر تعلیم یافتہ ہوتی تھیں' اس لیے دستخط کرتے وقت اکثر عورتوں کو فارم کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں ہوتا تھا۔

فطری سی بات ہے کہ ان قوانین پر سخت تنقید ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ ان قوانین سے نفرت اتنی بڑھ گئی کہ انہیں ختم کروانے کے لیے دو تنظیمیں قائم ہوئیں۔ اس مقصد کے لیے بہت سے ممتاز مرد و خواتین نے شبانہ روز کام کیا' جس میں ڈینئیل کوپر' جیمز سٹینسفیلڈ' فلورینس نائٹ انگیل' ہیریئٹ مارٹینو اور جوزفین بٹلر جیسے لوگ شامل تھے۔ تاہم 1886ء میں یہ قوانین ختم کیے گئے۔

اگرچہ آج بھی بہت سے انگریز قانون ساز اور مصلحین جسم فروشی پر ضابطوں کے نفاذ کے حامی ہیں لیکن ابھی تک طوائفوں کی رجسٹریشن اور طبی معائنے کی

ایسی کوئی کوشش دوبارہ نہیں کی گئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں فوجیوں میں جنسی امراض پھیل گئے تھے جس پر سلطنت کے دفاع کے ایکٹ میں 1918ء میں بیمار طوائفوں پر پابندی کی شق کا اضافہ کر دیا گیا۔ 1942ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران وزارتِ صحت نے یہ ضابطہ نافذ کیا کہ کسی جنسی مرض میں مبتلا دو افراد اگر ایک ہی عورت کو اس کی وجہ قرار دیں تو مذکورہ عورت کو اپنا علاج کروانے تک جسم فروشی کرنے سے روک دیا جائے۔ یہ قانون 1947ء میں ختم ہو گیا۔

امریکہ میں بھی تقریباً اسی زمانے میں جسم فروشی پر ضابطے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس زمانے میں برطانیہ میں اس کا تجربہ کیا جا رہا تھا۔ امریکہ کے سرجن جنرل کے دفتر سے وابستہ کرنل فلیچر نے طوائفوں پر طبی معائنہ کروانے کی پابندی لگا دی۔ اس کے تحت طوائفوں کو دس دن بعد طبی معائنہ کروانا ہوتا تھا۔ یہ نظام تین سال جاری رہا۔

امریکہ میں طوائفوں کی رجسٹریشن اور ان کے لازمی طبی معائنے کا نظام قائم کرنے کی دوسری کوشش 1872ء میں کی گئی۔ یہ اقدام سینٹ لوئیس میں اٹھایا گیا تھا۔ اس شہر میں جسم فروشی کرنے والی تمام عورتوں کو خواہ وہ چکلوں میں بیٹھتی تھیں، گلیوں میں دھندا کرتی تھیں یا مسٹریس تھیں، رجسٹریشن کروانے اور ہفتہ وار طبی معائنے پر مجبور کیا گیا۔ ہر رجسٹرڈ طوائف پر لازم تھا کہ جب بھی اس کا پتا تبدیل ہو، وہ پولیس کو اس کی اطلاع دے، خواہ وہ سینٹ لوئیس ہی میں کسی جگہ منتقل ہو رہی ہو یا کسی دوسرے شہر جا رہی ہو۔ تاہم یہ قانون صرف ایک سال باقی رہ سکا۔ اس قانون کے مخالفین نے اسے ''بدی کو لائسنس جاری کرنے والا قانون'' قرار دے کر اس پر شدید تنقید کی۔ انہوں نے ایک ہزار دستخطوں والی درخواست پیش کی تو حکام مذکورہ قانون کو ختم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس وقت سے جسم فروش عورتوں کی رجسٹریشن کی کوئی عمومی کوشش نہیں کی گئی سوائے 1910ء کے مشہور پیج لا (Page Law) کے سیکشن 79 کے، جس میں Any Pros Convicted as a Vagrant پر طبی معائنہ کروانا لازم قرار دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اب امریکہ اور کینیڈا کے کسی شہر میں ''ریڈلائٹ ایریا'' نہیں ہے۔ پہلی عالمی جنگ سے پہلے امریکہ کے ہر شہر میں ہر سائز کے ''ریڈلائٹ ایریا'' ہوتے تھے۔ چکلوں کے بند ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسم فروشی ختم ہو گئی ہے۔ طوائفیں دوسرے انداز سے اپنا دھندا کر رہی ہیں۔ وہ ذو معنی الفاظ والے اشتہارات کے ذریعے اپنے گاہکوں کو متوجہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ''کال گرل'' سسٹم بہت زیادہ فروغ پا گیا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ گاہک ایک ادارے کو فون کرتا ہے اور اپنی ضرورت سے آگاہ کرتا ہے۔ ادارہ متعینہ معاوضہ لے کر اس کی ضرورت پوری کر دیتا ہے۔

دنیا میں جسم فروشی کا جائزہ سابق سوویت یونین میں 1922ء میں طوائفوں کے خلاف شروع کی گئی مہم کے تذکرے کے بغیر ادھورا رہے گا۔ اس مہم کی منفرد خصوصیت یہ تھی کہ طوائفوں کے خلاف کوئی اقدامات نہیں کیے گئے بلکہ ان کا استحصال کرنے والے لوگوں یعنی دلالوں' چکلوں کے مالکان اور دوسرے بدی کے تاجروں کے خلاف اقدامات کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ طوائفوں کے پاس جانے والے مردوں کے ناموں اور پتوں کو عوام کے سامنے لے آیا گیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ عورتیں بے روزگاری کی وجہ سے جسم فروش بنتی ہیں' تمام کام کرنے کی اہل عورتوں کو روزگار مہیا کیا گیا اور طوائفوں کو تنخواہ کے ساتھ تعلیم اور تربیت بھی دی گئی تاکہ وہ کوئی ملازمت کر سکیں۔ اس کے علاوہ کم عمری میں شادی کی حوصلہ افزائی کی گئی نیز مرد اور عورت کو مساوی تسلیم کیا گیا تھا۔

تیسرا حصہ

جسم فروشی جدید عہد میں

چودھواں باب

قدیم ترین کسب، جدید ترین کسبیاں

آج پیشہ ور جسم فروشی کئی صورتوں میں موجود ہے، مختلف ملکوں میں اس کی مختلف صورتیں فروغ پا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں چکلوں میں بیٹھ کر دھندا کرنے والی جسم فروش عورتیں نہیں ہوتیں، جبکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسی طوائفیں موجود ہیں۔ دوسری طرف گلیوں میں گھوم پھر کر جسم فروشی کرنے والی عورتیں اکثر برطانوی شہروں میں عام موجود ہیں، جبکہ دوسرے ملکوں میں شاذ ونادر ہی ایسی طوائفیں دیکھی جاتی ہیں۔ (البتہ انگلینڈ میں طوائفوں کو کھلم کھلا گاہکوں کو ترغیب دینے کی اجازت نہیں ہے۔) بعض ملکوں میں رجسٹرڈ طوائفیں دھندا کرتی ہیں جبکہ بعض ملکوں میں جسم فروش عورتوں کی رجسٹریشن کا کوئی نظام نہیں ہے۔ عمومی طور پر چکلوں میں بیٹھنے والی طوائفوں کی رجسٹریشن ہو جاتی ہے تاہم چکلوں میں نہ رہنے والی طوائفوں کی بھی رجسٹریشن ہو جاتی ہے۔ جن ملکوں میں طوائفوں کی رجسٹریشن اور طبی معائنے کا نظام موجود ہے، ان ملکوں میں جسم فروشی کو ایک ایسی برائی سمجھا جاتا ہے جس کو برداشت کرنا ہو گا۔ دوسری طرف جن ملکوں میں طوائفوں کی رجسٹریشن اور طبی معائنے کا کوئی نظام نہیں ہے، ان ملکوں میں جسم فروشی کے مسئلے کو اس وقت تک نظرانداز کیا جاتا ہے جب تک کہ کوئی جسم فروش عورت کسی قابل تعزیر جرم میں ملوث نہیں ہو جاتی۔ جدید دور میں لوگوں کا رجحان بلاشبہ جسم فروشی پر ضابطے نافذ کرنے کے خلاف ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایسے ملکوں کی تعداد مسلسل کم ہو رہی ہے جن

میں جسم فروشی پر ضابطے نافذ ہوں۔

کچھ ملکوں میں چکلوں پر پابندی تو رہی لیکن ایک طرف خود جسم فروشی کو Breach of Law گیا ہے جبکہ ایسے ملکوں میں جہاں چکلوں پر پابندی نہیں ہے' وہاں گاہکوں کو ورغلانے پر پابندی ہے۔

یورپ میں صرف دو ریگولشنسٹ (Regulationist) ملک باقی ہیں۔ ان میں ایک ترکی ہے' جہاں تقریباً 300 باضابطہ چکلے موجود ہیں۔ دوسرا ملک ہے آسٹریا۔ آسٹریا کی انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہر بڑے صوبائی شہر میں تو چکلے موجود ہیں لیکن ویانا میں کوئی چکلہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انسبروک میں سٹیشن سے کوئی سوگز کے فاصلے پر دو چکلے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ ہر چکلے کے باہر ایک عام لباس والا آدمی موجود ہوتا ہے۔ اس کی ٹوپی پر سنہرے حروف میں لفظ پورٹر لکھا ہوتا ہے۔ گاہک اندر داخل ہوتا ہے تو نائیکہ اس کا پرجوش خیر مقدم کرتی ہے۔ اس کے بعد بہت خوبصورت لڑکیاں سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آ جاتی ہیں۔ گاہک ان کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی پسندیدہ لڑکی کا معاوضہ ادا کر کے ایک الگ کمرے میں اس کے ساتھ شب بسر کرتا ہے۔ یہ چکلے صاف ستھرے ہوتے ہیں اور ان کی خواب گاہوں کی دیواروں پر لمبے لمبے سرکاری نوٹس چسپاں ہوتے ہیں۔

جن ملکوں میں چکلوں کو گوارا کیا جاتا ہے' ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے۔ 1950ء میں ایسے ملک یہ تھے: الجیریا' ارجنٹیائن' بولیویا' چلی' چین' کولمبیا' کوشاریکا' ایکواڈور' مصر' اریٹیریا' ایتھوپیا' فرینچ کیمرونز' یونان' گوئٹے مالا' ہیٹی' ہندوستان' ہند چینی' عراق' اٹلی' کوریا' لبنان' مارٹینیق' مراکش' میکسیکو' نکاراگوا' پیرو' پرتگال' سینیگال' صومالی لینڈ' سپین' شام' تھائی لینڈ' تیونس' ترکی اور یوراگوئے۔

(Situation Abolitionist Mondiale, Published by the International Abolitionist Federation, Geneva, Switzerland, 1951)

اس کے بعد ان میں سے کچھ ملکوں میں چکلے ختم ہو گئے ہیں۔ ان میں سپین' پرتگال اور چین شامل ہیں۔ فرانس کے مشہور زمانہ چکلے دوسری عالمی جنگ کے بعد بند ہو گئے

تھے۔ 1957ء میں شائع ہونے والی ولفینڈن رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ چکلوں پر پابندی کے حامی ایک سو انیس ملکوں کے مقابلے میں صرف انیس ملک ایسے ہیں جو چکلوں کو گوارا کیے ہوئے ہیں۔

جن ملکوں میں جسم فروشی اور طوائفوں کے طبی معائنے کے حوالے سے ضابطے نافذ ہیں اس نظام کی بنیاد فرانس کا کئی عشرے پرانا نظام ہے۔ تاہم کچھ فرق ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ ملکوں میں تمام طوائفیں چکلوں میں بیٹھتی ہیں۔ کچھ ملکوں میں چکلے ہی نہیں ہیں اور جسم فروش عورتوں کو رجسٹریشن اور طبی معائنہ کروانے کی پابندی ہے۔

طوائفوں کی سب قسموں میں سے چکلوں میں بیٹھنے والی طوائفیں زیادہ غلامانہ صورتحال میں رہتی ہیں اور ان کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے۔ چکلے بہت زیادہ منافع کماتے ہیں لیکن اس کا بہت کم حصہ ان طوائفوں کو دیا جاتا ہے جنہوں نے اسے کمایا ہوتا ہے۔ عمومی طور پر یہ ہوتا ہے کہ چکلوں کی انتظامیہ گاہکوں سے متعینہ معاوضے پیشگی وصول کر لیتی ہے اور طوائفوں کو اس آمدنی میں سے متعینہ تناسب سے حصہ دیا جاتا ہے جو کہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ستم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے کھانے' کپڑوں' میک اپ وغیرہ کا معاوضہ چکلے کی انتظامیہ کو دینا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں بچتا بلکہ وہ مستقلاً چکلے کی انتظامیہ کی مقروض رہتی ہے۔ چکلے کی طوائف کی زندگی بہت دشوار ہوتی ہے۔ اسے چکلے میں کسی بھی وقت آنے والے کسی بھی گاہک کی جنسی بھوک مٹانی پڑتی ہے۔

فرانس اور دوسرے یورپی شہروں کے چکلوں میں طوائفیں نسبتاً زیادہ آزاد ہوتی تھیں اور عموماً زیادہ رقم کماتی تھیں۔ ان چکلوں میں طوائف انتظامیہ کی ملازم ہوتی تھی اور اسے اپنی کمائی میں سے ایک خاص تناسب سے حصہ ملتا تھا۔ تاہم فرق یہ تھا کہ وہ ایک متعینہ وقت تک چکلے میں آنے والے گاہکوں کی خدمت کرنے کی پابند تھی' اس کے بعد وہ اپنی مرضی سے کمانے کے لیے آزاد ہوتی تھی۔

چکلوں کا بہت زیادہ انحصار دلالوں پر ہوتا ہے۔ یہ دلال عموماً شوفر' بیرے'

شراب خانوں میں ساقی کا کام کرنے والے، حجام، گیراج میں کام کرنے والے اور اسی طرح کے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا مسافروں اور عام لوگوں کی بڑی تعداد سے رابطہ رہتا ہے لہٰذا وہ ان میں سے طوائف پرستوں کو منتخب کر سکتے ہیں۔ وہ کمیشن پر کام کرتے ہیں۔ اجنبی لوگوں کو طوائفوں تک رسائی پانا مشکل ہوتا ہے۔ دلال ان کی اس مشکل کو حل کر دیتے ہیں۔ جن ملکوں میں ''ریڈ لائٹ ایریا'' موجود ہیں، وہاں واقع چکلوں کے مالکان دلالوں کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ دنیا کے سارے ملکوں میں ایسے مشکوک ہوٹل ہوتے ہیں جو اپنے گاہکوں کے لیے طوائفیں فراہم کرتے ہیں یا جہاں گاہک طوائفوں کو لا سکتے ہیں۔

اب کچھ ان جسم فروش عورتوں کا احوال، جو رجسٹرڈ تو ہوتی ہیں لیکن کسی چکلے سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ وہ گلیوں، کافی خانوں (Cafe-Bars) اور شبینہ کلبوں میں دھندا کرتی ہیں۔ وہ کافی حد تک گاہکوں کے چناؤ میں آزاد ہوتی ہیں اور اپنی ساری کمائی کی مالک ہوتی ہیں۔ تاہم انہیں دوسرے حوالوں سے مسلسل ہراساں کیا جاتا ہے۔ انہیں لازماً مخصوص علاقوں میں ہی رہنا ہوتا ہے، انہیں صرف مخصوص اوقات ہی میں گاہکوں سے گفتگو کی اجازت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پولیس انہیں بلیک میل کر کے رقوم ہتھیاتی رہتی ہے۔ جسم فروشی سے مربوط بڑی برائیوں میں بلیک میلنگ سرِفہرست ہے۔ جسم فروشی کے حوالے سے معاشرے اور قانون کے ردِعمل سے بلیک میلنگ فروغ پاتی ہے۔ یہ بات ہر ملک پر صادق آتی ہے۔ چکلوں کے مالک ان آزادانہ دھندا کرنے والی طوائفوں میں سے موزوں لڑکیوں کو چن کر چکلوں میں لے آتے ہیں۔ بعض اوقات ایسی طوائفیں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے، وہ پولیس کی مستقل مداخلت سے پریشان ہوتی ہیں اور اپنے بھاری اخراجات پورا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں، وہ چکلوں میں بیٹھ جاتی ہیں۔

جس ملک میں جسم فروش عورتوں کی رجسٹریشن کا نظام ہوتا ہے، وہاں ضروری ہوتا ہے کہ ہر طوائف رجسٹرڈ ہو۔ تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ تمام تر اقدامات کے باوجود بے شمار طوائفیں خود کو رجسٹرڈ نہیں کرواتیں۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے

کہ جن ملکوں میں طوائفوں کی رجسٹریشن کا نظام رائج ہے' وہاں ایک رجسٹرڈ طوائف کے مقابلے میں دس غیر رجسٹرڈ طوائفیں دھندا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ بات دنیا کے ہر ملک پر صادق آتی ہے۔ ضابطے خواہ کتنے ہی سخت ہوں' پولیس کتنی ہی چوکس ہو' غیر رجسٹرڈ طوائفوں کو دھندا کرنے سے روکنا بہت مشکل ہے۔ اس کی وجوہات بیشمار ہیں۔ ایک تو یہ کہ عورتوں کی اکثریت اپنے اوپر طوائف کا ٹھپہ نہیں لگوانا چاہتی۔ وہ باقاعدہ طبی معائنہ کروانے کے ذلت آمیز عمل سے بھی گزرنا پسند نہیں کرتی۔ بعض طوائفوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کچھ عرصے بعد شادی کر لیں۔ کچھ طوائفیں کوئی دوسرا پیشہ اپنانا چاہتی ہیں۔ رجسٹرڈ طوائف عمر بھر کے لیے بدنام ہو جاتی ہے' اس لیے اکثر جسم فروش عورتیں ہر قیمت پر رجسٹریشن سے بچتی ہیں۔

طوائفوں کی اکثریت کے غیر رجسٹرڈ ہونے کی وجہ سے کسی قصبے' شہر یا ملک میں طوائفوں کی حقیقی تعداد کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ کتابوں اور پمفلٹوں میں حکومتوں یا سماجی تنظیموں کے فراہم کردہ جو اعداد و شمار درج کیے جاتے ہیں' وہ زیادہ تر قیاسی ہوتے ہیں۔ قیاسی اعداد و شمار نہ صرف ایسے شہروں کے حوالے سے ہوتے ہیں' جن میں رجسٹریشن کا نظام رائج ہوتا ہے بلکہ ایسے شہروں کے حوالے سے بھی ہوتے ہیں جن میں رجسٹریشن کا نظام رائج نہیں ہوتا۔

حالیہ برسوں میں یہ اہم بات سامنے آئی ہے کہ کم عمر طوائفوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ بلاشبہ ماضی کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں لڑکیاں بہت کم عمری میں جسم فروشی کا آغاز کر دیتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہمارے زمانے کی نمایاں خصوصیت یعنی قبل از وقت بالغ ہو جانے کے غیر معمولی رجحان کا نتیجہ ہے۔

کم عمر طوائف کو تقریباً ہر مرد زیادہ پسند کرتا ہے۔ بہت کم مرد ایسے ہوتے ہیں جو کم عمر یا اور کنواری دکھائی دینے والی طوائفوں کی طرف مائل نہیں ہوتے ورنہ مردوں کی اکثریت کم عمر طوائفوں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم زمانوں میں غیر تہذیب یافتہ نسلوں کے لوگ دوشیزگی کو زیادہ وقعت نہیں دیتے

تھے اور بعض جگہوں پر تو اسے برا سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں شب خوابی کا ساتھی تلاش کرنے والا ہر مرد ایسی لڑکی کو چاہتا ہے' جس کا پردۂ بکارت وہ پھاڑے۔ حالانکہ ایسی ساتھی پانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ کم عمر لڑکیوں سے جنسی مرض لاحق ہونے کا خطرہ بہت کم ہوتا ہے۔ طوائف کا کنوارپن برقرار ہونا ایک ایسی خوبی ہے کہ چکلوں کے مالکان تجربہ کار طوائفوں کے مقابلے میں ایسی طوائف کا معاوضہ گاہک سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ طوائفوں نے کنوارپن کا دھوکا دینے کے بہت سے طریقے ڈھونڈ لیے ہیں۔ سب سے سادہ طریقہ پھٹکڑی یا سرکے کا استعمال ہے۔ طوائفیں پانی میں گھولی ہوئی پھٹکڑی یا سرکے کو اندام نہانی کی ڈھیلی جلد میں کساؤ پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ پردۂ بکارت پھٹنے کے وقت بہنے والے خون کے حوالے سے دھوکا یوں دیا جاتا ہے کہ حیض کے خون کو وہی خون باور کرا دیا جاتا ہے۔ ایرک وولفن نے اپنی کتاب (Woman As A Sexual Criminal) میں ایک پرانے ہتھکنڈے کے بارے میں بتایا ہے کہ طوائفیں خون سے بھرے بہت چھوٹے غبارے اندام نہانی میں رکھ لیتی تھیں' جو مجامعت کے دوران پھٹ جاتے اور گاہک کو دھوکا دیا جاتا کہ پردۂ بکارت پھٹا ہے اور خون بہہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ بستر کی چادر پر کبوتر کا خون بکھیرا جاتا تھا۔ بعض اوقات سرجری کے ذریعے اندام نہانی کو کنواری لڑکی جتنا تنگ کروا دیا جاتا تھا۔

طوائفوں کی تعداد میں اضافے کا بالواسطہ تعلق ملک کی خوشحالی سے ہوتا ہے۔ بعض دوسرے خصوصی حالات بھی اس کا سبب ہوتے ہیں مثلاً جنگ یا بڑی تعداد میں مردوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران فرانس اور برطانیہ میں طوائفوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ان جنگوں کے بعد ساری دنیا میں اور بالخصوص نیویارک' لندن' پیرس اور دوسرے چھوٹے شہروں میں کافی عرصے تک طوائفوں کی تعداد بہت زیادہ رہی۔ اسی طرح معاشی بدحالی اور بحران کے زمانے میں بھی جسم فروش عورتوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ 1920ء کی دہائی میں غیر معمولی افراطِ زر کے دوران برلن میں بیشمار معزز عورتیں

جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے وسائل اکٹھے کرنے کی خاطر گلیوں میں آنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ انہیں کھلم کھلا گاہکوں کو بلاوے دیتے دیکھا جا سکتا تھا۔ 1945ء میں جنگ کے خاتمے کے بعد جرمنی میں قابض فوجی ایک عورت کی قیمت تین سگریٹ ادا کرتے تھے۔

بعض ملک تارکینِ وطن سے اپنے ملک کی عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی ہم وطن طوائفوں کو بھی درآمد کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مردوں کی اکثریت دوسری قوموں کی عورتوں کو ترجیح دیتی ہے لہٰذا حکومتیں اپنے ملک کے مفاد میں اس طرح کے حفاظتی اقدامات کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ مشرقی ممالک میں خصوصاً ایسا ہوتا ہے۔

ہر بڑا شہر طوائفوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ طوائفیں اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہوتی ہیں کہ جہاں کہیں مرد زیادہ تعداد میں مجتمع ہوتے ہیں' وہاں ان کے دھندے کے پنپنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر کچھ شہروں میں طوائفوں کی کثرت نہ محسوس ہو یا وہ کھلم کھلا گلیوں میں پھرتی دکھائی نہ دیتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان شہروں میں جسم فروشی نہیں ہوتی۔

اس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ ضابطے یا ذیلی قوانین اتنے سخت ہیں کہ طوائفوں کے لیے کھلم کھلا دھندا کرنا زیادہ خطرے کا باعث ہے۔ جن شہروں میں طوائفوں کو کھلے عام گاہک ڈھونڈنے کی اجازت ہوتی ہے' وہاں کچھ مخصوص گلیاں ان کے لیے وقف ہوتی ہیں اور طوائفوں کے متلاشی مرد وہیں جاتے ہیں۔

1959ء میں انگلینڈ میں نافذ ہونے والے قانون "سٹریٹ آفینس ایکٹ" نے لندن شہر کا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ وکٹورین عہد میں لندن کا ہائیڈ پارک طوائفوں کی آماجگاہ ہوتا تھا۔ ایک شخص نے اپنا نام ظاہر نہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ 1953ء مین حالت یہ تھی کہ ہائیڈ پارک میں موجود طوائفیں دس شلنگ وصول کر کے کسی درخت کے پیچھے جنسی عمل کروا لیتی تھیں۔ بعض لڑکیاں پانچ شلنگ کے عوض چومنے اور بغل گیر ہونے کی سہولت دیتی تھیں۔ لندن کی بہت سے گلیوں مین شام ہوتے ہی

کم عمرلڑکیاں اور تجربہ کار طوائفیں نکل آتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کے پاس کمرے ہوتے تھے اور باقی کھلی فضا میں جنسی لذت مہیا کرتی تھیں۔ مجھے ایک طوائف ملی۔ اس نے بتایا کہ پیڈنگٹن کے نزدیک ایک ہوٹل میں اس کے پاس کمرا ہے اور وہ عارضی طور پر جسم فروشی کر رہی ہے۔ دراصل اسے برائٹن میں محنت کشوں کے لیے بنایا گیا ایک کیفے خریدنے کے لیے رقم درکار تھی۔ 1958ء میں کرزن سٹریٹ میں طوائفوں کو گاہک پھانستے دیکھا جا سکتا تھا۔ ان میں کچھ طوائفوں کے پاس کاریں ہوتی تھیں اور وہ انہیں کہیں ٹھہرا کر ان میں بیٹھی بیٹھی گاہکوں کو بلاوے دیتی تھیں۔

جون 1952ء کو مسٹر باسل ایل۔ ہنرک جے پی نے ایسٹ لندن ایڈورٹائزر کو بتایا کہ اس نے برنر سٹریٹ اور ہیٹی سٹریٹ کے درمیان واقع کمرشل سٹریٹ میں اٹھارہ طوائفوں کو شمار کیا تھا اور کینٹن سٹریٹ روڈ پر اس نے 50 سے 80 طوائفوں کو گنا تھا۔ اس کا کہنا تھا: ''لندن کے ایک علاقے میں یہ بالکل نئی بات ہے۔'' میں نے اپنی تحقیق کے دوران ان علاقوں میں طوائفوں کی گنتی کی تو صرف 6 سے 12 تک پایا حتیٰ کہ اتوار کے دن بھی — ان میں سے بیشتر طوائفیں دس شلنگ میں ہمبستری پر تیار ہوتی تھیں۔ سٹیپنی بہت مدت بعد تک جسم فروش عورتوں کے حوالے سے بدنام رہا۔

ویسٹ اینڈ کی طوائفوں کے معاوضے زیادہ ہوتے ہیں۔ کارک سٹریٹ اور اس کے قرب و جوار میں دھندا کرنے والی طوائفیں چار پونڈ لیتی ہیں جبکہ گلاس ہاؤس سٹریٹ کے علاقے میں دھندا کرنے والی طوائفیں عموماً دو پونڈ لیتی ہیں جبکہ تیس شلنگ جتنے کم معاوضے میں سودا کر لینا غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ سوہو میں یہ عمومی معاوضہ ہوتا ہے۔ کچھ لڑکیاں ''ساری رات'' گزارنے کا معاوضہ پانچ پونڈ وصول کرتی ہیں۔

روپرٹ سٹریٹ کا زیریں سرا رات کے وقت ٹیکسی ویمن کے لیے مختص ہوتا ہے، جن کی عمومی فیس 30 شلنگ ہوتی ہے، تاہم یہ دو پونڈ تک بھی ہو سکتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور دس شلنگ لیتا ہے اور جوڑے کو کسی پرسکون جگہ لے جاتا ہے مثلاً ٹرافالگر سکوائر کے نزدیک سفلوک سٹریٹ میں اور پھر پچھلی سیٹ پر جنسی عمل ہوتا ہے۔

طوائفیں عام طور پر تھوڑے سے کپڑے اتارتی ہیں تاہم میں ایک ایسی طوائف کو جانتا ہوں جو سارے کپڑے اتار دیتی ہے! ایک اور طوائف نے مجھ سے تقاضا کیا کہ میں چلتی ہوئی ٹیکسی میں جنسی عمل کروں۔

بعض چالاک گاہک طوائف کو کمرے میں لے جانے سے پہلے طے کر لیتے ہیں کہ وہ سارے کپڑے اتارے گی۔ کچھ طوائفیں ایسا کرنے سے انکار کر دیتی ہیں اور کچھ 30 شلنگ سے دو پونڈ تک زیادہ معاوضہ لے کر سارے کپڑے اتارنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔

بعض طوائفیں اس سے مراد لیتی ہیں کہ انگیا اور نیکر کے علاوہ سارے کپڑے اتارے جائیں گے۔ بہت کم ــــ بہت ہی کم طوائفیں بالکل عریاں ہونے پر تیار ہوتی ہیں۔ بیشتر طوائفیں کاہل ہوتی ہیں اور اسی لیے تمام کپڑے اتارنے اور دوبارہ پہننے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سودا طے ہو جانے کے بعد طوائف اپنے گاہک کے ساتھ کمرے میں، ٹیکسی میں، درخت یا دیوار کے پیچھے جلدی جلدی جاتی ہے۔

'وہ جتنی جلد ممکن ہو اسے فارغ کر کے دوسرا گاہک پھانسنا چاہتی ہے۔ وہ چھتری لیے، بھڑک دار لباس پہنے آگے آگے چلتی ہے اور گاہک چند گز پیچھے ہوتا ہے۔ طوائفوں کے کمرے عموماً فرشی منزل پر نہیں ہوتے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتی ہے اور اس کے بعد گاہک اندر آ جاتا ہے۔ خواب گاہ کے ساتھ باورچی خانہ ہوتا ہے، جس میں عموماً ایک ملازمہ بیٹھی ہوتی ہے۔

طوائف اپنا معاوضہ اور ملازمہ کے لیے بخشیش وصول کرتی ہے۔ پھر وہ اور گاہک بستر پر چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں اس بڑے بیڈ کے علاوہ فرنیچر کم ہی ہوتا ہے۔ بستر پر چادر بچھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس مقصد کے لیے دیوان استعمال کیا جاتا ہے۔ جنسی عمل شروع ہوتا ہے تو طوائف کی کوشش ہوتی ہے کہ مرد جلد از جلد فارغ ہو جائے۔

تاہم عمومی طور پر وہ مرد کو اپنی اندام نہانی کو چھونے نہیں دیتی۔ جنسی عمل

کے بعد مرد کنڈوم اتارتا ہے اور ٹائیلٹ پیپر یا تولیے سے اپنے عضوتناسل کو صاف کرتا ہے۔ (تولیے سے صفائی میں یہ خطرہ مضمر ہوتا ہے کہ جنسی بیماریاں ایک فرد سے دوسرے کو لگ سکتی ہیں۔) اس کے بعد دونوں کپڑے پہنتے ہیں پھر مرد کمرے سے چلا جاتا ہے۔ اس کے چند منٹ بعد طوائف بھی واپس اپنے ٹھکانے پر چلی جاتی ہے۔ تاہم ایسا اکثر نہیں ہوتا اور وہ گاہک کے ساتھ ہی نکلتی ہے اور راستے میں اسے باور کراتی جاتی ہے کہ وہ ایک منفرد طوائف ہے۔

طوائفوں کے کمرے بہت پست حالت میں ہوتے ہیں۔ تاہم کچھ طوائفوں کے فلیٹ بہتر حالت میں ہوتے ہیں اور ان میں اچھا فرنیچر موجود ہوتا ہے۔ اکثر طوائفوں کے کمروں میں پلنگ کے علاوہ عموماً ایک ڈریسنگ ٹیبل اور دو کرسیاں ہوتی ہیں۔

شاید دس فیصد طوائفوں کے کمروں کی دیواروں پر ننگی عورتوں کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں۔ فرنیچر کی کمی اور دیگر آرائشی اشیاء کی عدم موجودگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ طوائف کو اپنے کمرے کا بہت زیادہ کرایہ اور پیشگی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ کرایہ عموماً 20 پونڈ فی ہفتہ اور پیشگی 150 پونڈ ادا کرنا پڑتے ہیں۔

طوائف کی ملازمہ اکثر اوقات ایسی سابقہ طوائف ہوتی ہے جو عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے گاہک کو ڈھونڈنے میں ناکام رہتی ہے۔ یہ ملازمہ طوائف کو بعض سادیت پسند مردوں سے بچانے کا کام بھی کرتی ہے کیونکہ ایسی وارداتیں ہو چکی ہیں کہ جن میں طوائفوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

طوائفوں کے سر پر دوسرا بوجھ جرمانوں کا ہوتا ہے۔ عموماً انہیں دو پونڈ جرمانہ باقاعدگی سے دینا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں اپنے علاقے کے پولیس والوں کو بھی مالی یا جسمانی رشوت دینا ہوتی ہے۔ تاہم ایک جسم فروش لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ ڈیوٹی کے اوقات کے بعد آنے والے سپاہیوں کو گاہک شمار کرتی ہے۔

انگلینڈ میں بھی دنیا کے ہر ملک کی طرح گاہک نئے چہروں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ نئی آنے والی طوائف چند ہفتوں تک بہت مقبول رہتی ہے۔ اس کے بعد

اسے اس علاقے سے نکل کر کہیں اور جانا پڑتا ہے۔ چند ہی طوائفیں ایک علاقے میں زیادہ عرصے تک رہ پاتی ہیں۔ نئی لڑکیاں مسلسل آتی جاتی رہتی ہیں۔

ایک حقیقتاً کامیاب طوائف کافی دولت کما سکتی ہے۔ ایک طوائف نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک دن میں 30 شلنگ فی مجامعت کے حساب سے زیادہ سے زیادہ 37 مردوں کو بھگتایا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے کبھی اپنی اوسط آمدنی کا حساب تو نہیں رکھا تاہم یقیناً یہ وزیراعظم کی آمدنی سے زیادہ ہے --- اور وہ بھی ٹیکس فری! اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی کمائی جوئے میں خرچ کر دیتی ہے۔

بعض لڑکیوں کو ساری ساری رات کوئی گاہک نہیں ملتا۔ پیڈنگٹن کی ایک جسم فروش لڑکی نے بتایا کہ جس رات میں اس سے ملا تھا اس سے گزشتہ رات اس نے صرف ایک دس شلنگ والا گاہک بھگتایا تھا۔ کچھ طوائفیں دن میں بھی کام کرتی ہیں، تاہم کامیاب طوائفیں ایسا نہیں کرتیں۔

عمومی مغالطوں کے برخلاف اوسط طوائفیں سدومیت یا کسی اور جنسی کجروی پر بہت کم آمادہ ہوتی ہیں۔ کچھ طوائفیں، بالخصوص فرانسیسی طوائفیں، منہ سے جنسی تسکین مہیا کرنے پر تیار ہوتی ہیں۔ تاہم بیشتر طوائفیں مجامعت کی کسی غیر فطری حالت کو قبول نہیں کرتیں۔

میں اپنے اچھے خاصے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اوسط جسم فروش لڑکی دیانتدار ہوتی ہے اور اپنے گاہک کو دھوکا دینے یا لوٹنے کی کوشش نہیں کرتی۔ جسم فروش لڑکیوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ صحت کے حفاظتی اصولوں سے لاپروائی برتتی ہیں، تاہم عملی طور پر سب طوائفیں کنڈوم استعمال کرنے پر اصرار کرتی ہیں۔

جہاں تک لندن میں دھندا کرنے والی بیشتر فرانسیسی جسم فروش لڑکیوں کا تعلق ہے تو وہ کنڈوم استعمال کرنے پر اصرار نہیں کرتیں، تاہم یہ حقیقت ہے کہ انگریز طوائفوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھری ہوتی ہیں۔ ان کے گاہکوں کو ان سے جنسی مرض لگنے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے۔ پیرس میں بھی کنڈوم استعمال نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ وہاں کیتھولک اثرات کا زیادہ ہونا ہے۔

لندن میں صرف فرانسیسی طوائفیں ہی دھندا نہیں کرتیں۔ میں نے سوہو میں ایک جاپانی لڑکی کو جسم فروشی کرتے ہوئے دیکھا۔ وہاں میں نے ایک آئرش اور ایک سکاٹش طوائف کو بھی دیکھا۔ ان کی قومیت خواہ کوئی بھی ہو' تاہم ایسا لگتا ہے کہ مقامی عورتوں کے دھندے پر وہ کافی اثرانداز ہوئی ہیں۔

1959ء کے سٹریٹ آفینس ایکٹ کے نفاذ کے بعد' کہ جس میں سزائے قید کا خطرہ مضمر ہے' لندن زیادہ صاف ستھرا شہر بن گیا ہے اور طوائف پرستوں میں مشہور علاقوں یعنی سوہو' بے واٹر روڈ' شیفرڈ مارکیٹ وغیرہ سے جسم فروش لڑکیاں غائب ہو گئی ہیں۔

کچھ طوائفوں نے اپنے کمروں کے دروازوں پر ''ماڈل'' کی تختی لگا کر جسم فروشی جاری رکھی ہوئی ہے۔ تاہم بیشتر سٹریٹ گرلز غائب ہو چکی ہیں۔ بے واٹر اور کینسنگٹن ایریا کے کچھ خاص نیوز ایجنٹوں کے شوکیسوں میں اشتہاری پوسٹ کارڈ لگے ہوتے ہیں' جن میں ڈھکے چھپے یا عیاں الفاظ میں طوائف پرستوں کو رابطے کی دعوت دی گئی ہوتی ہے۔ ان پر فون نمبر بھی درج ہوتے ہیں۔ بعض پوسٹ کارڈوں پر پتے بھی درج ہوتے ہیں' جو عموماً جھونپڑپٹیوں کے ہوتے ہیں۔

ان علاقوں میں طوائفیں عموماً عمارتوں کے تہہ خانوں میں رہتی ہیں۔ یقیناً اب طوائف پرستوں کو ''عمدہ شے'' کی تلاش میں ماضی جیسی سہولت نہیں رہی ہے۔ پولیس نے ان نیوز ایجنٹوں کو دھمکا کر اور لیڈیز ڈائریکٹری چھاپنے والے ایک پبلشر کو قید کر کے اس سلسلے کو بھی ختم کروا دیا ہے۔

ہر بڑے شہر میں طوائفیں بلیک میلروں اور کارڈ شارپروں کے ساتھ مصروف کار ہیں۔ ایسی طوائف گاہک کو اپنے کمرے میں لے جاتی ہے تو اوپر سے اس کا مشتعل ''شوہر'' آ جاتا ہے اور دونوں کو دھمکاتا ہے۔ آخر گاہک کچھ رقم ادا کر کے جان چھڑاتا ہے۔ دوسری صورت میں طوائف گاہک کو جوا خانے میں لے جاتی ہے جہاں اسے جوئے کے کھیل میں بے ایمانی کے ذریعے لوٹ لیا جاتا ہے۔

بعض طوائفیں اپنے گاہک کے سو جانے کے بعد اس کی رقم اڑا لیتی ہیں یا

گاہک نشے میں دھت ہو تو وہ اس کی جیبیں خالی کر دیتی ہیں۔ ایسی طوائفوں کو یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کوئی گاہک پولیس کو رپورٹ کرے گا۔ تاہم کچھ لوگ پولیس کو رپورٹ بھی کر دیتے ہیں۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ لندن کی بعض طوائفوں کو اس جرم میں سزا دی گئی کہ انہوں نے اپنے گاہک کو جنسی تسکین دیئے بغیر اس سے رقم ہتھیالی تھی! عموی طور پر بیشتر شہروں کی زیادہ تر طوائفیں بلیک میلنگ یا چوری نہیں کرتیں۔

پندرہواں باب

غیر پیشہ ور طوائفیں

اپنے جسموں کو بیچ کر روزی کمانے والی عورتوں کے علاوہ ایسی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے' جو دوسرے کام کر کے پوری یا ادھوری روزی کما رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی آمدنیوں میں اضافے کی غرض سے جسم فروشی بھی کر رہی ہیں۔

ایسی غیر پیشہ ور طوائفیں کئی عشروں سے بڑے قصبوں اور شہروں میں پنپ رہی ہیں۔ ساٹھ ستر سال پہلے دکانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے بہت کم جسم فروشی کرتی تھیں۔ اس زمانے میں تھیٹر اور میوزک ہالز میں کام کرنے والی لڑکیوں نے اپنی آمدنیوں میں اضافے کے لیے یہ راہ اپنا لی تھی۔

موجودہ زمانے میں ہر شعبے میں کام کرنے والوں کی آمدنیاں ماضی کے مقابلے میں کافی بہتر ہو چکی ہیں۔ اب بہت کم لڑکیوں کو ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر گلیوں میں نکلنا پڑتا ہے۔ تاہم انوکھی بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں غیر پیشہ ور طوائفوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ایسی لڑکیوں کا تعلق معاشرے کے ہر طبقے سے ہوتا ہے اور اگر انہیں اشارتاً بھی کہہ دیا جائے کہ وہ جسم فروشی کر رہی ہیں تو وہ غصے سے پھٹ پڑتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی لڑکیاں اخلاقی اعتبار سے نام کے فرق کے سوا ہر حوالے سے طوائف ہوتی ہیں۔

غیر پیشہ ورانہ جسم فروشی کے فروغ کی بہت سی وجوہات ہیں۔ عورتوں کی

آزادی، بالخصوص جنسی آزادی، اس کی بنیادی وجہ ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک لڑکی پر اس کے والدین کا کنٹرول اتنا کم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی ایسی لڑکی سے زیادہ آزادی سے لطف اندوز ہو رہی ہے، جو کہ اپنے والدین کے کنٹرول میں زیادہ ہوتی تھی۔ موجودہ زمانے میں لڑکیوں کا سگریٹ پینا، شراب نوشی کرنا، بہت زیادہ میک اپ کرنا، ہر وقت گھر سے باہر رہنا، جنس اور ضبطِ حمل سے آگاہ ہونا، فحش ادب پر گفتگو کرنا اور نشہ خوری کرنا فیشن کا حصہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج کی لڑکیاں ماضی کی لڑکیوں کی نسبت واقعی جنس کا زیادہ علم رکھتی ہیں؟ ماضی میں جنس سے دور کا بھی واسطہ رکھنے والی باتوں کو بے شرمی سمجھا جاتا تھا جبکہ آج بے دھڑک ہر جنسی موضوع پر گفتگو کرنا عام ہو چکا ہے۔ دراصل موجودہ دور کی لڑکیاں اور ان کے والدین جنسی عمل کے نام پر مغالطوں کا شکار ہیں۔

غیر پیشہ ور طوائفوں کی تعداد میں اضافے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کاروباری دنیا میں زیادہ تعداد میں داخل ہو رہی ہیں۔ یہ عمل ناجائز جنسی تعلقات میں اضافے کا باعث بنا ہے۔ اس کے نتیجے میں اخلاقیات کا معیار بھی پست ہو گیا ہے نیز مرد کی طرف سے شہوانی پیشتر فتوں کی مزاحمت میں بھی کمی آ گئی ہے۔ ہر عورت امکانی طوائف ہے اور ہر مرد ایک امکانی گاہک۔ مسئلہ صرف اور صرف پیسے کا ہے۔ ایسی لڑکی جو اپنے طبقے کے مرد کو رد کر دیتی ہے، وہ کسی ممتاز سماجی یا فلمی شخصیت کا آسان شکار بن جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اشرافیہ طبقے کی عورت کسی شہزادے کی شکار بن جائے۔

عورتوں کی آزادی سے پہلے زرعی طبقے کی لڑکی کے پاس شادی یا جسم فروشی کے سوا دوسرا کوئی پیشہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایک اچھے شوہر کا حصول ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے ایک ایسے مرد کی تلاش ہوتی تھی جو اسے زندگی بھر کے لیے گھر مہیا کر دے۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس قیمتی ہیرے جیسا کنوارپن ہوتا تھا۔ وہ اس ہیرے کو مرد کے سامنے جھلاتی رہتی تھی۔ موجودہ زمانے میں شادی ماضی کی طرح کا اہم ترین معاملہ نہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ

بیشتر نارمل لڑکیاں شادی کو اپنے کامیاب کیریئر کا نقطۂ عروج سمجھتی ہیں تاہم وہ بھی اس کی فوری ضرورت کے خبط میں مبتلا نہیں رہیں۔ وہ ''اچھے وقت'' کے آنے سے پہلے شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر بھی تیار نہیں اور ''اچھے وقت'' کا تذکرہ آج کل ہر لڑکی کر رہی ہے۔ شادی کو دھندلے مستقبل میں دھکیل دیا گیا ہے اور جنسی ایڈونچرز معمولات کا حصہ بن گئے ہیں۔ جدید لڑکی اپنی جوانی ہی میں خوب مزے کر لینا چاہتی ہے کیونکہ وہ مستقبل کو غیر یقینی سمجھتی ہے۔ وہ ارادتاً ایسے ماحول اور حالات کا حصہ بنتی ہے جنہیں جنسی تحریک کے لیے تخلیق کیا گیا ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ بالکل اجنبی مردوں کی صحبت میں ہوتی ہے' جس کے لازمی نتیجے میں وہ زیادہ سے زیادہ ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے لگتی ہے۔

انہی وجوہات کے تحت دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے ہر شہر میں رہنے والی معزز لڑکیوں کی کثیر تعداد اجنبی مردوں کے ساتھ ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے پر تیار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پیشہ ور طوائف کی زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ اسے ان غیر پیشہ ور جسم فروش لڑکیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے امکانی گاہکوں کی تعداد میں زیادہ کمی آ رہی ہے۔ ہر اوسط جنسی شکاری پیشہ ور طوائفوں کے مقابلے میں غیر پیشہ طوائفوں میں اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل ممکن پاتا ہے۔ وہ ہمیشہ غیر پیشہ ور کو پیشہ ور پر اور معزز لڑکی کو طوائف پر ترجیح دیتا ہے۔ تاہم دنیا کے ہر ملک میں مردوں کی اکثریت غیر پیشہ ور طوائفوں تک محفوظ طریقے سے رسائی پانے میں ناکام رہی ہے۔ دولت مند مردوں کی اپنی خفیہ عیش گاہیں ہوتی ہیں۔ ماضی میں یورپ کے دارالحکومتوں کے مہنگے ریستورانوں میں ایسے پرائیوٹ رومز ہوا کرتے تھے۔ لندن میں 1930ء تک یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔ غیر پیشہ ور طوائفوں کے معاملے میں مردوں کو یہ دشواری بھی ہوتی ہے کہ وہ مستقل طور پر دھندا نہیں کرتیں' یہ صرف موقعے کی بات ہوتی ہے۔ چنانچہ مردوں کو اپنی جنسی ضرورتوں کی تسکین کے لیے پیشہ ور طوائفوں ہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

غیر پیشہ ور طوائفوں کو ترجیح دینے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ

ہے کہ وہ سستی ہوتی ہیں۔ رقم کا تقاضا تو شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ دس میں سے نو غیر پیشہ ور طوائفوں کو تو پیسے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ مرد کو جو قیمت ادا کرنا ہوتی ہے وہ عموماً محض ایک یا دو شراب کے جام، تھیٹر کی ایک ٹکٹ، چاکلیٹ کا ایک ڈبا ہوتی ہے۔ تاہم مرد معاوضے کی وجہ سے غیر پیشہ ور طوائف کو ترجیح نہیں دیتا۔ دوسری اہم وجہ جنسی بیماریوں کا خوف ہے۔ ایک عمومی مغالطہ ہے کہ تقریباً ہر پیشہ ور جسم فروش عورت جنسی بیماریوں سے متاثر ہوتی ہے۔ دوسرا عمومی مغالطہ یہ ہے کہ غیر پیشہ جسم فروش لڑکیاں، جنہیں طوائف نہیں سمجھا جاتا، جنسی امراض سے محفوظ ہوتی ہیں۔ غیر پیشہ ور لڑکیوں کے انتخاب کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تقریباً ہر مرد یہ سمجھتا ہے کہ ایسی لڑکی بہت سے مردوں کی مشترکہ ملکیت نہیں ہے۔

سولھواں باب

عورتوں کی تجارت

ماضی میں چکلوں کے ذریعے جسم فروشی کا ایک نتیجہ وہ تھا جسے عموماً ''سفید فام غلاموں کی تجارت'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چکلوں میں بٹھائے جانے یا مسٹریسز بنائے جانے کے لیے جن لڑکیوں کی تجارت ہوتی تھی' ان میں سب سفید فام نہیں ہوتی تھیں۔ مشرق کے چکلوں میں سیاہ فام' سانولی اور پیلے رنگوں والی طوائفیں بہت بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو بھی طوائفوں کا دھندا کرنے والے لوگ اسی طرح لاتے ہیں جیسے سفید فام لڑکیوں کو۔

دنیا کے ہر ایسے ملک میں طوائفوں کی طلب میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا ہے جہاں مردوں کی تعداد عورتوں سے کم ہو جاتی ہے' خواہ مستقلاً' خواہ عارضی طور پر۔ نئے نئے آباد ہونے والے ملکوں میں یا ایسے علاقوں میں جہاں کسی بھی وجہ سے عورتوں کی تعداد کم ہوتی ہے' یہی صورتحال سامنے آتی ہے۔ اسی طرح مردوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے سے بھی طوائفوں کی طلب میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس کو افواج یا لشکروں کے ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں کہیں اس طرح کی نقل و حرکت ہوتی ہے' وہاں عورتوں کی طلب بھی جنم لیتی ہے۔ فوجیوں کو سستی طوائفوں کی طلب ہوتی ہے۔ دولت مند لوگوں کو عورتوں کی قلت کے زمانے میں بھی اپنی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوتا۔ امیر طبقے میں نئی طوائفوں کی طلب مستقل طور پر رہتی ہے۔

جب دولت مند لوگوں کا دل ایک خوبصورت عورت سے اکتا جاتا ہے تو وہ دوسری عورت منگوا لیتے ہیں۔ اکثر امیر مرد کنواری لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے مرد بھی ہوتے ہیں جو اپنی کجرویانہ جنسی خواہشات پورا کرنے والی لڑکیوں کو زیادہ معاوضہ ادا کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ دولت مند لوگ غیر ملکی لڑکیوں کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔

اگر چکلوں میں مقامی عورتوں کی تعداد کافی بھی ہو تو گاہکوں کی مطلوبہ عورتوں کا مہیا کرنا ان کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں میں مقامی لڑکیوں کو چکلوں میں لانا یا جسم فروشی کے دھندے میں لانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ چکلوں میں زندگی بسر کرنے کے حالات پست اور معاوضے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی چکلوں کی بہت سی ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لڑکیاں آزادانہ جسم فروشی کی طرف مائل ہورہی ہیں۔ جن ملکوں میں آزادانہ جسم فروشی کی اجازت نہیں ہے وہاں بھی طوائفیں جس قدر ممکن ہوتا ہے رجسٹریشن کروانے سے بچتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مقامی طوائفوں پر انحصار کرنے والے چکلوں کو صرف گھٹیا درجے کی طوائفوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات ایسے چکلوں میں عمر رسیدہ طوائفیں ہوتی ہیں۔ چکلے کے مالکان کے پاس خوبصورت نوجوان لڑکیوں کے حصول کا واحد راستہ یہی بچتا ہے کہ غیر ملکی لڑکیوں کو اپنے شکنجے میں پھنسایا جائے۔

جن ملکوں میں غیر ملکی طوائفوں کی کثرت ہوتی ہے وہاں اس کثرت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حکومتیں سمجھتی ہیں کہ اپنے ملک کی لڑکیوں اور عورتوں کو جسم فروشی سے محفوظ رکھنے کے لیے غیر ملکی لڑکیوں کو طوائف بنانا درست ہے۔ ایسی حکومتیں غیر قانونی طور پر اپنے ملک میں آنے والی دوسرے ملکوں کی عورتوں اور لڑکیوں کو ملک بدر نہیں کرتیں۔

جنوبی امریکی ملکوں اور مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں میں موجود چکلوں کے مالکان ہمیشہ یورپی طوائفوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ چکلے کا وجود

نئ عورتوں کی سپلائی کا محتاج ہوتا ہے اور اس طلب کو پورا کرنے کے لیے عورتوں کے تاجر ہر وقت سرگرم رہتے ہیں۔ 1927ء میں لیگ آف نیشنز کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ''لائسنس یافتہ چکلوں کی وجہ سے عورتوں کے تاجروں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کا جواز ملتا ہے۔'' پہلی عالمی جنگ سے پہلے صرف بیونس آئرس میں 4500 غیر ملکی طوائفیں دھندا کر رہی تھیں۔ موجودہ دور میں بھی ارجنٹائن میں مقامی طوائفوں کے مقابلے میں فرانسیسی طوائفوں کی تعداد زیادہ ہے۔

یہ کاروبار بہت وسیع ہے اور بے شمار لوگ دلالوں کی حیثیت سے اس سے منسلک ہیں۔ ان دلالوں کی روزی کا انحصار چکلوں کو لڑکیاں فراہم کرنے پر ہوتا ہے یا وہ چکلوں کے گاہکوں کو لڑکیاں فراہم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ''میڈم'' ہوتی ہیں' جو کہ چکلوں کا انتظام چلاتی ہیں۔ چکلوں کے مالکان لڑکیوں کی خرید و فروخت کے لیے سرمایہ مہیا کرتے ہیں' تاہم وہ چکلوں میں شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔

دلال غیر پیشہ ور طوائفوں کو اکثر اوقات ورغلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ انہیں تھیٹر' سینما' رقص گاہوں اور ریستورانوں میں لے جاتے ہیں اور انہیں تحائف دیتے ہیں۔ آخر میں وہ انہیں دوسرے ملک کی سیر پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ عام طور پر ''مچھلی'' ''چارے'' کو نگل لیتی ہے۔ یہ طریقہ لندن یا کسی دوسرے شہر آ کر محنت مزدوری کرنے والی باعزت غریب لڑکیوں کو پھانسنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور عورتوں کے تاجر اس میں اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ اگر اس قسم کی لڑکیوں پر دوسرا ہر حربہ ناکام ہوتا نظر آئے تو عورتوں کے بیوپاری ان سے جھوٹی شادی رچا لیتے ہیں۔ یوں ان کے راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو جاتی ہے اور وہ مناسب وقت پر لڑکی کو چکلے والوں کے ہاتھ فروخت کر آتے ہیں۔

عورتوں کے تاجر کورس گرلز' نچلے درجے کے تھیٹروں اور ٹورنگ کمپنیوں نیز سٹیج پر کام کرنے کی خواہش مند لاتعداد لڑکیوں میں اپنا شکار ڈھونڈتے ہیں اور بآسانی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دلال مشرقِ وسطیٰ میں سٹیج شو کروانے والے پروڈیوسروں یا تھیٹر ایجنٹوں کا بہروپ بھر کر ناتجربہ کار لڑکیوں کو اڑا لے جاتے ہیں۔ وہ ایسی لڑکیوں

کو رقاصہ، گلوکارہ یا کیبرے ڈانسر کی ملازمت کا جھانسا دیتے ہیں۔ جلد یا بدیر ان لڑکیوں کو طوائف بنا دیا جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ طے ہونے کی دیر ہے، پھر وہ جلد ہی طوائف بنا دی جاتی ہیں۔

کچھ لڑکیاں اپنی مرضی سے بھی چکلوں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ بعض لڑکیوں کو ملازمت کی نوعیت کا پورا پورا علم تو نہیں ہوتا لیکن انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی غیر اخلاقی کام ہے، پھر بھی وہ حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر حامی بھر لیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بے پناہ مشکلات سے گزر رہی ہوتی ہیں۔ پیسوں کی قلت یا موجودہ ملازمت کی غیر یقینیت ان مشکلات میں نمایاں ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ پہلے سے جسم فروشی کرنے والی ایسی لڑکیاں جو دوسرے ملکوں کے چکلوں میں جانے پر آمادہ ہوتی ہیں، مالی مشکلات کا شکار ہوتی ہیں۔ جہاں تک آزادانہ دھندا کرنے والی طوائف کا تعلق ہے تو ممکن ہے وہ دوسرے ملک میں دھندے کی پیشکش کرنے والے عورتوں کے تاجر کے منہ پر تھوک دے۔

جب کوئی کم عمر لڑکی اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک جانے پر راضی ہو جاتی ہے تو اسے چکلے میں بٹھا دیا جاتا ہے اور چکلے کے مالکان ساری عمر اس کا استحصال کرتے ہیں۔ عمومی طور پر اس لڑکی کو کمیشن دیا جاتا ہے لیکن اس کمیشن میں سے اس کے لباس، خوراک، میک اپ اور دوا علاج کا معاوضہ نیز پولیس کو دیئے جانے والے بھتے میں اس کا حصہ کاٹ لیا جاتا ہے۔ بیشتر صورتوں میں وہ ہمیشہ چکلوں کی مقروض رہتی ہے۔ چکلے کی میڈم کی پالیسی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی طوائفوں کو اپنا مقروض رکھے تاکہ وہ اس کی فرمانبرداری کرتی رہیں۔

مشہور سوئس ماہر عمرانیات کارل برنارڈ نے طویل تحقیق کے بعد بتایا کہ 500 طوائفوں میں سے 15 فیصد کا تعلق نچلے طبقے سے، 28 فیصد کا تعلق درمیانے طبقے سے اور 15 فیصد کا تعلق بالائی طبقے سے تھا۔ 65-1960ء میں آسٹریا، فرانس، اٹلی، جرمنی اور سپین سے غائب ہو جانے والی لڑکیوں کی تعداد 5496 تھی۔ امکان ہے کہ انہیں چکلوں میں بٹھانے کے لیے غائب کیا گیا تھا۔ ان میں 3000 لڑکیوں کا تعلق غریب

طبقے سے تھا۔ 63 فیصد کی عمریں 15 سے 21 سال کے درمیان تھیں۔ صرف 7 فیصد کی عمریں 25 سال سے زیادہ تھیں۔ برنارڈ کے بقول عورتوں کے تاجروں کا مثالی شکار غریب طبقے کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔

طوائف اور دلال کا باہمی تعلق عمرانیات کے طالب علموں کے لیے ہمیشہ ایک پہیلی رہا ہے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ ایک عورت کسی ایسے مرد کے لیے' جو کہ اس کا شوہر نہیں ہوتا' اپنا جسم بیچنے پر آمادہ ہو جاتی ہے جبکہ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ اکثر دلال طوائفوں کے ساتھ سختی بھی کرتے ہیں۔ بہت سے محققین کا کہنا ہے کہ دراصل یہ دلال ان طوائفوں سے محبت کرتے ہیں جبکہ طوائف بھی ان سے محبت کرتی ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ ان کے تعلق کی وجہ خوف ہے۔ دلال سفاک مجرم ہوتے ہیں اور جو عورت ان کے شکنجے میں پھنس جاتی ہے' وہ ان کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے جسم فروشی پر مجبور ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں وجوہات کسی حد تک درست ہیں۔ دلال عورت کا محافظ ہوتا ہے۔ طوائفیں بھی دوسری عورتوں کی طرح انسان ہوتی ہیں۔ وہ سب ہی کرخت چہرے والی منہ پھٹ عورتیں نہیں ہوتیں' جیسا کہ عام تصور ہے۔ حتیٰ کہ نچلے درجے کی طوائف بھی اپنے گاہکوں کے لیے مہربان ہوتی ہے۔ بعض گاہک ایسے ہوتے ہیں جو متعینہ فیس ادا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ طوائف اس سلسلے میں قانون کی مدد تو لے نہیں سکتی۔ وہ سماجی اعتبار سے دھتکاری ہوئی ہوتی ہے اور معاشرے کے ایک نام نہاد معزز فرد کے خلاف اس کے کسی الزام پر توجہ نہیں دی جاتی۔ انہی وجوہات کے تحت وہ کسی دلال کو ڈھونڈتی ہے۔ اسے جب کبھی تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ دلال کی خدمات حاصل کرتی ہے۔ دلال اس کے دھندے میں پیش آنے والی بہت سی رکاوٹوں کو ہٹانے میں اس کا معاون ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی ناتجربہ کار' کم عمر اور سیدھی سادی طوائفیں بھی دلالوں کی مدد حاصل کرتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں ایک سے دوسرے دلال یا ایک چکلے سے دوسرے چکلے تک منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں انسانوں کی حیثیت سے اپنے حقوق کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ وہ بے جان اشیاء کی طرح بکتی رہتی ہیں۔ وہ کبھی بغاوت کا

سوچتی تک نہیں ہیں۔

عورتوں کے تاجر منشیات اور فحش ادب اور تصویروں کی تجارت بھی کرتے ہیں۔ منشیات اور فحش تصویریں چکلوں میں مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہیں۔ فحش تصویروں کی فروخت بہت سی طوائفوں کے دھندے کا حصہ ہوتی ہے۔

جسم فروشی کے لیے بھرتی کی جانے والی بیشتر لڑکیاں کچھ عرصے تک طوائف کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ عموماً وہ پہلا موقع ملنے پر دھندا نہیں چھوڑتیں۔ سنسنی خیز فلموں' ناول اور اخبارات کے ذریعے مشہور ہونے والا یہ تصور درست نہیں ہے کہ طوائفیں حقیقتاً قیدی ہوتی ہیں اور ایک مرتبہ چکلے میں آجانے کے بعد وہاں سے فرار نہیں ہوسکتیں۔ ان لڑکیوں کو زنداں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر وہ چاہیں تو فرار ہوسکتی ہیں اور اپنے ملکوں کے سفیروں سے مدد لے سکتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی قسمت پر راضی ہوجاتی ہیں۔ میرا خیال ہے' شاید میں غلطی پر ہوں' کہ انہیں روزی کمانے کا دوسرا راستہ نظر نہیں آتا' اس لیے وہ اس دھندے کو اختیار کرلیتی ہیں اور مستقل طور پر اس سے وابستہ رہتی ہیں۔

جسم فروشی کے دھندے میں داخل ہونے سے لڑکیوں کو روکنے کی حکومتوں' اخلاق پرستوں' سوشل ورکروں وغیرہ کی تمام اپیلیں ناکام ہوچکی ہیں۔ تم لوگوں کو برائی سے نہیں روک سکتے۔ برائی سے روکنے کا ہر انتباہ برائی کا اشتہار ہوتا ہے۔ عورتوں کی تجارت کو قانون سازی کے ذریعے یا دیگر طریقوں سے روکنے کی کوششیں صرف جزوی طور پر کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

سترھواں باب

جسم فروشی اور قانون

تمام مہذب ملکوں میں طوائف کو سماجی اعتبار سے ایک خارش زدہ کتیا اور اچھوت سمجھا جاتا ہے اور اس سے شاذ ہی انصاف کیا جاتا ہے۔ ایسے بہت سے مردوخواتین جو دوسرے سماجی مسائل کے حوالے سے معقول اور انصاف پسند ہوتے ہیں، جسم فروشی سے وابستہ مسائل پر غور شروع کرتے ہی ناانصاف، ناروادار اور سنگدل بن جاتے ہیں۔ وہ صورتحال کو تعصب سے پاک ہوکر دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ نوجوان لڑکوں کو طوائف پرست اور نوجوان لڑکیوں کو طوائفیں بننے سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ ایک فریق کے لیے سخت سزاؤں والے قانون نافذ کرنے پر تو فوری طور پر تیار ہوجاتے ہیں۔ لیکن برابر کے ذمہ دار دوسرے فریق کے حوالے سے کسی اقدام پر اصرار نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال برطانیہ اور امریکہ جیسے مہذب ملکوں میں بے شمار لڑکیوں اور عورتوں کو ایسے جرائم میں جرمانے اور قید کی سزائیں دی جارہی ہیں جو نہ تو فوجداری جرائم ہیں نہ دیوانی۔۔۔ یعنی صرف جسم فروشی کو بطور پیشہ اپنا کر اپنے گاہکوں کو بلاوا دینے پر۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں برطانیہ میں نافذ کیے جانے والے تمام ضابطے کچھ عرصے بعد غیر مقبول ہوگئے تھے۔ حالیہ برسوں میں بھی ضابطوں کو نافذ کرنے کی دوبارہ کوششیں ہوئیں لیکن مخالف تنظیموں نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ طوائفوں کو لائسنس جاری کرنے کے نظام کا مطلب برائی کو لائسنس

جاری کرنا ہے۔

برطانوی قانون کے مطابق کسی طوائف کے خلاف کسی قسم کا اقدام صرف اس بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ طوائف ہے۔ اس کے خلاف کوئی اقدام اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب اس نے جسم فروشی کے ساتھ کوئی اور قابل تعزیز جرم کیا ہو۔ اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ طوائف کا جسم فروشی سے روزی کمانا قانونا جرم تو نہیں ہے لیکن اس کا طوائف ہونا ہی اس کے ہر عمل کو غیر قانونی بنا دیتا ہے۔ کسی عام عورت کا جو عمل قانون شکنی نہیں ہوتا' وہی عمل طوائف کرے تو قانون شکنی کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی دکان یا فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکی گلیوں میں گھوم پھر کر مردوں سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی ہے لیکن اگر کوئی طوائف یہی عمل کرے تو قانون کی نگاہ میں یہ ایک جرم ہوگا۔ میٹروپولیٹن پولیس ایکٹ 1839ء سیکشن 54(11) کے تحت اگر کوئی طوائف گلیوں میں گھوم پھر جسم فروشی کے مقصد کے تحت لوگوں سے گفتگو کرے تو اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ 54(13) میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو گالیاں دے رہا ہو اور اس عورت پر پہلے بھی مردوں کو بلاوے دینے کا الزام لگ چکا ہو تو اس عورت کو گرفتار کرلیا جائے۔ 1824ء کے ویگرینسی ایکٹ کے سیکشن 3 کے تحت اگر کوئی طوائف عوامی جگہوں پر پائی جائے تو اسے کاہل شخص تصور کیا جائے گا۔ برطانوی قانون کے مطابق ایسے شخص پر 5 پونڈ جرمانہ عائد کردیا جاتا ہے یا ایک ماہ کے لیے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ طوائف دوسری مرتبہ یہ جرم کرے تو اسے ''سرکش اور بدمعاش'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی سزا بیس پونڈ جرمانہ یا تین ماہ قید ہے۔ اگر وہ اس کے بعد یہی جرم کرے تو اس مرتبہ اسے ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

ٹاؤن پولیس کلازز ایکٹ 1847ء کے تحت اگر کوئی طوائف گلیوں میں کسی مسافر کو جسم فروشی کی ترغیب دیتی پائی جائے تو کانسٹیبل اسے بغیر وارنٹ گرفتار کرسکتا ہے اور مختصر کارروائی کے بعد اسے 40 شلنگ جرمانہ یا 14 دن قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ یہ قانون لندن کے باہر شہری علاقوں پر نافذ ہے۔

سکاٹ لینڈ میں ایڈنبرگ اور ایبرڈین کے باہر کے علاقوں میں گھومنے والی

طوائف کو دس پونڈ جرمانہ یا 60 دن قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اگر اگلے سات برسوں کے دوران وہ طوائف دوبارہ جرم کرے تو اسے زیادہ جرمانہ یا قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔

انگلینڈ اور ویلز میں ''غصہ'' قانون کا بنیادی حصہ ہے۔ کوئی مرد غصے کا ثبوت نہیں دے سکتا مگر عدالتیں بدقسمتی سے مبینہ طور پر جسم فروش عورت کے بلاوے پر غصے میں آجانے والے مردوں کو درست مان لیتی ہیں۔ اس امر میں ذرا سا بھی شبہ نہیں ہے کہ عدالتیں بے شمار عورتوں کو بغیر کسی موزوں ثبوت کے مذکورہ قوانین کے تحت سزا دے چکی ہیں۔

لندن میں میٹروپولیٹن پولیس ایکٹ 1839ء کے تحت سزا چالیس شلنگ جرمانہ ہے' لہٰذا ملزمہ مقدمہ لڑنے کی بجائے مجرم ہونا قبول کرلیتی ہے۔ 1957ء میں دی وولفینڈن رپورٹ میں کہا گیا ''محسوس کیا گیا ہے کہ طوائفوں کو بار بار عدالت کے سامنے پیش کرنا' ان کا مقدمہ مزید لڑنے سے انکار اور چالیس شلنگ جرمانہ ادا کرنا قانون کی تضحیک کا سبب بن رہا ہے۔'' رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اس قانون پر نظرثانی کی جانی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ سزاؤں میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔

برطانیہ میں جنسی معاملات کے حوالے سے سرکاری رجحان یہ ہے کہ وولفینڈن رپورٹ کا ہم جنس پرستی کے حوالے سے قانون میں نرمی پیدا کرنے والا حصہ نظر انداز کردیا جاتا تھا۔ 1967ء میں اس حوالے سے ایک قانون بنایا گیا۔ طوائفوں کے حوالے سے زیادہ سخت قانون 1959ء میں بنایا گیا تھا۔ اس کا نام سٹریٹ آفینس ایکٹ تھا۔ اس میں طوائفوں کو زیادہ سخت سزاؤں کا مستوجب قرار دیا گیا تھا۔

❁❁❁

اٹھارہواں باب

جسم فروشی کا مستقبل

موجودہ زمانے میں جسم فروشی کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ زوال پذیر ہے۔ لندن، نیویارک، پیرس اور دوسرے بڑے شہروں میں گزشتہ پچاس برسوں کے مقابلے میں بہت کم طوائفیں موجود ہیں۔ چکلوں میں بیٹھنے والی طوائفیں بہت کم ہوگئی ہیں۔ اسی طرح چکلوں کے باہر دھندا کرنے والی رجسٹرڈ طوائفیں بھی بہت کم ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ عرصے تک پیشہ ور طوائفیں ختم ہو جائیں گی۔ یہ خیال پوری طرح درست نہیں ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ بہت سے ملکوں میں سخت قوانین اور دوسری وجوہات کے تحت جسم فروشی کم دکھائی دیتی ہے۔ پچاس سال پہلے کی طوائفیں بہت مہذب ہوتی تھیں۔ وقت گزرتا گیا اور معزز لڑکیوں نے ایسا لباس پہننا شروع کر دیا کہ طوائفوں اور ان میں کوئی فرق نہیں رہا۔

طوائفوں میں کمی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا زیادہ بااخلاق ہوگئی ہے، کنوارے مرد باکردار ہوگئے ہیں، اور شادی شدہ لوگ اپنی بیویوں پر ہی قناعت کرنے لگے ہیں۔ اس کے برعکس ہوا یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں بدکرداری بڑھ گئی ہے۔ دراصل عورتوں میں بدکرداری اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ جسم فروش عورتوں کے پیشے پر کاری ضرب پڑی ہے۔ مرد جنسی تسکین کے لیے ہر سال زیادہ تعداد میں ان نام نہاد ''معزز لڑکیوں'' کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور پیشہ ور طوائفوں کی طرف کم جا رہے

ہیں۔ چنانچہ پیشہ ور جسم فروشی میں کمی اور نام نہاد باعزت لوگوں میں بدکرداری میں اضافہ بیک وقت رونما ہوا ہے۔ صورتحال اسی سمت جا رہی ہے' جیسی کہ غیر مہذب اور نیم مہذب ملکوں میں حاوی ہوتی تھی۔ ایسے معاشروں میں مردوں کی ہوس پوری کرنے والی طوائفوں کی طرح کی الگ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ بدکرداری ہر طرح کی سماجی حیثیت والے مردوں اور عورتوں میں بڑھ رہی ہے۔ اب ایسا نہیں رہا کہ اونچے طبقے کے مرد اور نچلے طبقے کی عورتیں بدکردار ہوں۔

اب کنوار پن کو برا سمجھا جانے لگا ہے۔ ضبط حمل کی وجہ سے غیر پیشہ ور طوائفوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اب بلاشبہ لاتعداد لڑکیاں اور عورتیں حمل کے خوف سے آزاد ہوکر ناجائز جنسی عمل کے لیے ''گولی'' استعمال کر رہی ہیں۔ بلاشبہ وہ جنسی بیماریوں کے خطرے سے بھی بے نیاز ہیں۔

عورتوں میں بدکرداری کے فروغ سے پیشہ ور طوائفوں پر پڑنے والے منفی اثرات کو بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ طوائفوں کی بجائے عام لڑکیوں کو ترجیح دینے کے مردوں کے رجحان کے علاوہ ایک بڑی وجہ معاشیات بھی ہے۔ پیشہ ور طوائف کے مقابلے میں باعزت لڑکی کے ساتھ جنسی ایڈونچر مرد کے لیے کم خرچ ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جسم فروشی کی ابتداء ہی سے اس کو زناکاری کے ساتھ مقابلہ درپیش تھا۔ ایک کا عروج دوسری کے زوال کا باعث ہوتا تھا۔ زنا مرد کے لیے بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔ یہ کم خرچ ہوتا ہے۔ یہ محفوظ ہوتا ہے۔ بعض حلقوں میں اسے فیشن بھی سمجھا جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں انگلینڈ اور امریکہ میں زناکاری فیشن بن گئی ہے۔ ان سب عوامل نے طوائفوں کے پیشے پر اثر ڈالا ہے۔ جسم فروشی اب ایک عبوری مرحلے میں دکھائی دے رہی ہے۔ لوگ اب بھی اس کے حوالے سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ تاہم غیر پیشہ ور طوائفوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

بدکرداری کے حوالے سے یہ رجحان نیا نہیں ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دوران اسے گوارا کرلیا گیا تھا' جس کی وجہ فوجیوں کی جنسی ضروریات پورا کرنا تھا۔

یہ نئی فروغ پذیر عمرانی صورتِ حالات پیشہ ور جسم فروش عورتوں میں کمی لا رہی ہیں۔ واقعات کے عمومی بہاؤ سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ پیشہ ورانہ جسم فروشی میں زوال جاری رہے گا۔ ایسا نہیں لگتا کہ اس زوال کا باعث بننے والے عوامل کے اثرات کم ہوں گے یا یہ عوامل معدوم ہوجائیں گے۔ اس کے برعکس یہ امکان بہت مضبوط ہے کہ ان کی وسعت اور اثرات میں اضافہ ہوگا نیز کچھ اور ایسے عوامل بھی رونما ہوں گے جو پیشہ ورانہ جسم فروشی کے زوال میں اضافہ کردیں گے۔ مثال کے طور پر عورتوں میں ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے کے رجحان میں مزید اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کی وجہ نہ صرف عورتوں کی آزادی ہوگی بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ مردوں میں شادی کرنے کا میلان کم ہوجائے گا۔ عورتوں میں بدکرداری کے فروغ کی دیگر وجوہات میں معاشرے کی طرف سے بدکردار عورتوں کو الگ تھلگ کردینے کی صدیوں تک برقرار رہنے والی روایت کا خاتمہ ہے۔ مزید براں مردانہ و نسائی ہم جنس پرستی اور دیگر جنسی کجرویوں کے عام ہونے کی وجہ سے بھی پیشہ ورانہ جسم فروشی کا زوال جاری رہے گا۔

ان سب امکانات وعوامل کے سبب اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ پیشہ ورانہ جسم فروشی تہذیب یافتہ ملکوں سے غائب ہوجائے گی۔ یہ درست ہے کیونکہ جیسا کہ میں ثابت کرچکا ہوں، جب ہر کوئی وہی کچھ کررہا ہو جو حقیقتاً جسم فروشی ہی ہوتی ہے تو ایسے میں جسم فروشی جیسی کوئی شے باقی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا باعزت عورتوں میں بدکرداری کے فروغ سے پیشہ ورانہ جسم فروشی میں ناگزیر طور پر کمی رونما ہوسکتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود پیشہ ورانہ جسم فروشی مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکتی۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زیادہ سے زیادہ مرد اب بلامعاوضہ جنسی لذت حاصل کرنے کی طرف مائل ہورہے ہیں، جبکہ ماضی میں مردوں کو اس حوالے سے کافی معاوضے ادا کرنے پڑتے تھے۔ تاہم اس بات کا اطلاق تمام مردوں پر نہیں ہوتا۔ زیادہ تر کم عمر مرد ہی بلامعاوضہ جنسی تسکین کے حصول کی طرف مائل ہیں۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ طوائفوں کے گاہکوں کی اکثریت شادی شدہ مردوں پر

مشتمل ہوتی ہے۔ شادی شدہ مرد بہت سی وجوہات کے تحت اپنی بیویوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے جنسی آسودگی پانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ میں اس کتاب کے پہلے حصے میں بتا چکا ہوں کہ کسی عورت کی جنسی سردمہری اس کے شوہر کے اپنے جنسی جذبے کی آسودگی کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کرنے پر مجبور کرنے والا سب سے اہم عامل ہوتی ہے۔ بیویوں اور شوہروں میں پائی جانے والی جنسی عدم موافقت پیشہ ور جسم فروشی کے فروغ کا بڑا سبب ہے۔ بیویاں جنسی حوالے سے خودغرض ہوتی ہیں اور سوائے غریب طبقے کی عورتوں کے اکثر عورتیں اپنے شوہروں کی جنسی بھوک مٹانے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مرد زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنی جنسی بھوک بروقت یا فوری طور پر مٹانے کے لئے طوائفوں کے ہاں جانے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہواری کے ایام میں بھی بیویاں اپنے شوہروں کو جنسی آسودگی فراہم کرنے میں تامل کا اظہار کرتی ہیں۔ حمل کی صورت میں یا بیوی کی بیماری کی وجہ سے طویل وقفے بھی مرد کے لیے کوفت اور بے قراری کا باعث بنتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض مرد مذہبی حوالے سے ایسے ایام میں بیویوں سے دور رہتے ہیں تاہم ایسا سب مردوں کے حوالے سے درست نہیں ہے۔ شادی شدہ مردوں کی اکثریت ضبط سے کام نہیں لیتی اور وہ طوائفوں کے ہاں جانا شروع کردیتے ہیں۔

برطانیہ اور امریکہ میں آج بھی جنس کے حوالے سے واضح طور پر منافقانہ رویے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مناسب جنسی تعلیم کا بھی فقدان ہے۔ ان وجوہات کے سبب اکثر شادیاں ناکامی سے دوچار ہوجاتی ہیں۔ ناکامی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طلاق ہوجاتی ہے۔ نتیجہ طلاق سے بھی بدترین نکلتا ہے اور وہ یہ کہ شادی برقرار رہتی ہے لیکن دونوں فریق بہت زیادہ ناخوش اور مضطرب رہنے لگتے ہیں۔ اکثر بیویاں جنسی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنے شوہروں کی جنسی ضروریات پوری کرتے ہوئے کراہت محسوس کرتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شوہر جلد یا بدیر کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ شوہر محبت کے فن

سے ناواقف ہوتا ہے اور بیوی کو اس کی جنسی دست درازیوں کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے مرد جنسی کجرو ہوتے ہیں اور اپنی جنسی بھوک کجرو افعال سے مٹاتے ہیں۔ ایسے مردوں میں شادی شدہ' غیر شادی شدہ' جوان' بوڑھے سبھی شامل ہوتے ہیں۔ وہ نارمل جنسی عمل سے یا نارمل طریقے سے انگیخت ہونے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان جنسی کجرو مردوں کی بیویاں' داشتائیں اور گرل فرینڈز ان کی جنسی خواہشات کو پورا نہیں کرسکتیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان باعزت لڑکیوں کو مطلوبہ جنسی معلومات نہیں ہوتیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے کجرو افعال کو کراہت اور تذلیل کے احساسات کے تحت رد کردیتی ہیں۔ ایسی صورت میں واحد راستہ پیشہ ور جسم فروش عورتوں سے رجوع کرنا ہوتا ہے۔

جہاں تک کجرو مردوں کی جنسی بھوک کا تعلق ہے تو باعزت لڑکیاں کبھی اس حوالے سے کامیاب نہیں ہوسکیں گی۔ صرف اس وجہ سے پیشہ ورانہ جسم فروشی اس وقت تک ایک عمرانی مسئلہ رہے گی' جب تک تہذیب باقی ہے۔

اخلاق پرست اور مصلحانہ اصولوں کے حامل افراد کی یہ امید پوری نہیں ہوسکتی کہ طوائفوں کو سزائیں دے کر پیشہ ورانہ جسم فروشی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ لوئیس فرینکلن فریڈ نے اپنی قابل تعریف کتاب The Problem Of European Prostitutes In Johannesburg میں جسم فروشی کے خلاف جنگ کی ناکامی کا احوال یوں لکھا ہے: ''صوبہ ٹرانسوال میں جسم فروشی کے حوالے سے بنائے گئے قوانین میں اس مسئلے کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں گیا' لیکن اسے مسئلے کے حل کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔'' وولفینڈن رپورٹ بھی فریڈ کے خیالات کی توثیق کرتی ہے: ''جسم فروشی ایک ایسی سماجی حقیقت ہے جس کی مذمت اخلاق پرست' عمرانیات داں اور ہمیں یقین ہے کہ' عام لوگ بھی کرتے ہیں۔ تاہم یہ بہت سی تہذیبوں میں کئی صدیوں سے موجود ہے۔ سخت سزاؤں کے ذریعے اسے ختم کرنے کی ہر کوشش کی ناکامی سے پتا چلتا ہے کہ اسے فوجداری قانون کے ذریعے ختم نہیں کیا جاسکتا۔'' (Report Of The

Committee On Homosexual Offences And Prostitution, London, H.M.S.O, 1957) یہ حقائق اتنے اہم ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

گزشتہ صفحات میں پیش کی جانے والی جسم فروشی کی تاریخ ایک غیر معمولی سبق دیتی ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ سخت قوانین' سماجی مقاطعے اور اخلاقی ضابطوں کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ جسم فروشی زیرزمین چلی جاتی ہے۔ معاشی صورتحال میں انقلابی تبدیلی ہی سے جسم فروشی میں کمی ممکن ہے۔

انڈین کال گرلز

تحقیق: پرومیلا کپور ☆ ترجمہ: سلیم خان قیمت:-/160

بھارتی حسیناؤں کے جنسی کارناموں کا دلچسپ بیانیہ' گناہ کی دلدل میں گردن تک دھنسے جسموں کی کہانیاں، کافر جوانیوں کی جنسی بدعنوانیوں کے قصے، ''بھارت ماتا'' کی گمراہ بیٹیوں کی حقیقی آپ بیتیاں' گھر سے گلی اور بھوک سے بازار تک بھارتی عورت کے سفر کی چونکا دینے والی داستان اور اس سوال کا حتمی جواب کہ غیر شادی شدہ، شادی شدہ، بیوائیں اور مطلقہ ورکنگ اور نان ورکنگ خواتین صرف ایک فون پر۔۔۔اپنا آپ کیوں بیچتی ہیں؟

ہندو ادب کے سربستہ جنسی راز

تانترا

مصنف: ایشلے تھربلی ☆ مترجم: سلیم خان ☆ قیمت -/90

اس میں آپ کو واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ آپ کا جسم آپ کے ذہن کا غلام ہے اور آپ کا ذہن آپ کا غلام ۔لہٰذا آپ اپنے ذہن پر قابو پا کر اپنے جسم پر بالواسطہ حکمرانی کر سکتے ہیں ۔''تانترا'' جنسی حوالے سے ہمیشہ جوان رہنے کا فن سکھاتی ہے۔ یہ آپ کی بے مہار جنسی قوت کو جکڑ کر آپ کے حوالے کر دیتی ہے۔اس اہم کتاب کا ہر صفحہ شہوت حاصل کرنے ،اُس پر قابو پانے اور اُسے اپنے مرضی سے استعمال کرنے کے فن کا آسان بیانیہ ہے۔جنسی ادب کی مختصر سے مختصر فہرست بھی اس کتاب کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی۔

کاما سوترا

تصنیف: وتسیایانا ○ سنسکرت سے انگریزی: سر رچرڈ برٹن ○ ایف ایف آر بوتھناٹ

انگریزی سے اردو: سلیم خان ○ قیمت-/250

بیوی کیساتھ ہم بستری کے خفیہ اسرار و رموز' جنسی نشست و برخاست کے منفرد طریقے' مردانہ قوت کی بحالی اور استحکام کے قدیم ترین نسخہ جات' جنسی کشش کے لحاظ سے عورتوں اور مردوں کی اقسام' عشق' طوائف' شادی اور حصول لذت کیلئے کی جانی والی سازشوں پر روشنی ڈالتی ہوئی یہ کتاب مغرب میں 80 سال تک پابندیوں کا شکار رہی۔ پاکستان میں صرف ''نگارشات'' اس کتاب کا اردو ترجمہ اصل انگریزی متن کے ساتھ آپ تک پہنچا رہا ہے۔ 80 سال پہلے یورپ' امریکہ اور ہندوستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا کلاسیک۔

پاکستان میں جسم فروشی

مصنف: مجاہد حسین ○ قیمت-/160

ایک کہنہ مشق صحافی کے قلم سے ان گلیوں کا احوال جہاں جسم بکتے ہیں۔ پاکستان کے گلی محلوں' اداروں' چوراہوں اور ایوانوں میں بکھری غلاظت کا اشاریہ۔ پاکستان میں جسم فروشی کی تاریخ کا مکمل احاطہ کرتی ہوئی اپنی نوعیت کی واحد کتاب۔ جس میں جسم فروشی کی تاریخ کا مختصر مگر جامع تذکرہ بھی شامل ہے جو اس الجھے ہوئے سوال کا واضح جواب فراہم کرتا ہے کہ عورت کب' کیسے اور کیوں طوائف بنی نیز مرد نے کس کس ڈھنگ سے اسے ''دستی دکان'' کا ''مہنگا کھلونا'' بنایا۔

عورت، مرد اور تاریخ

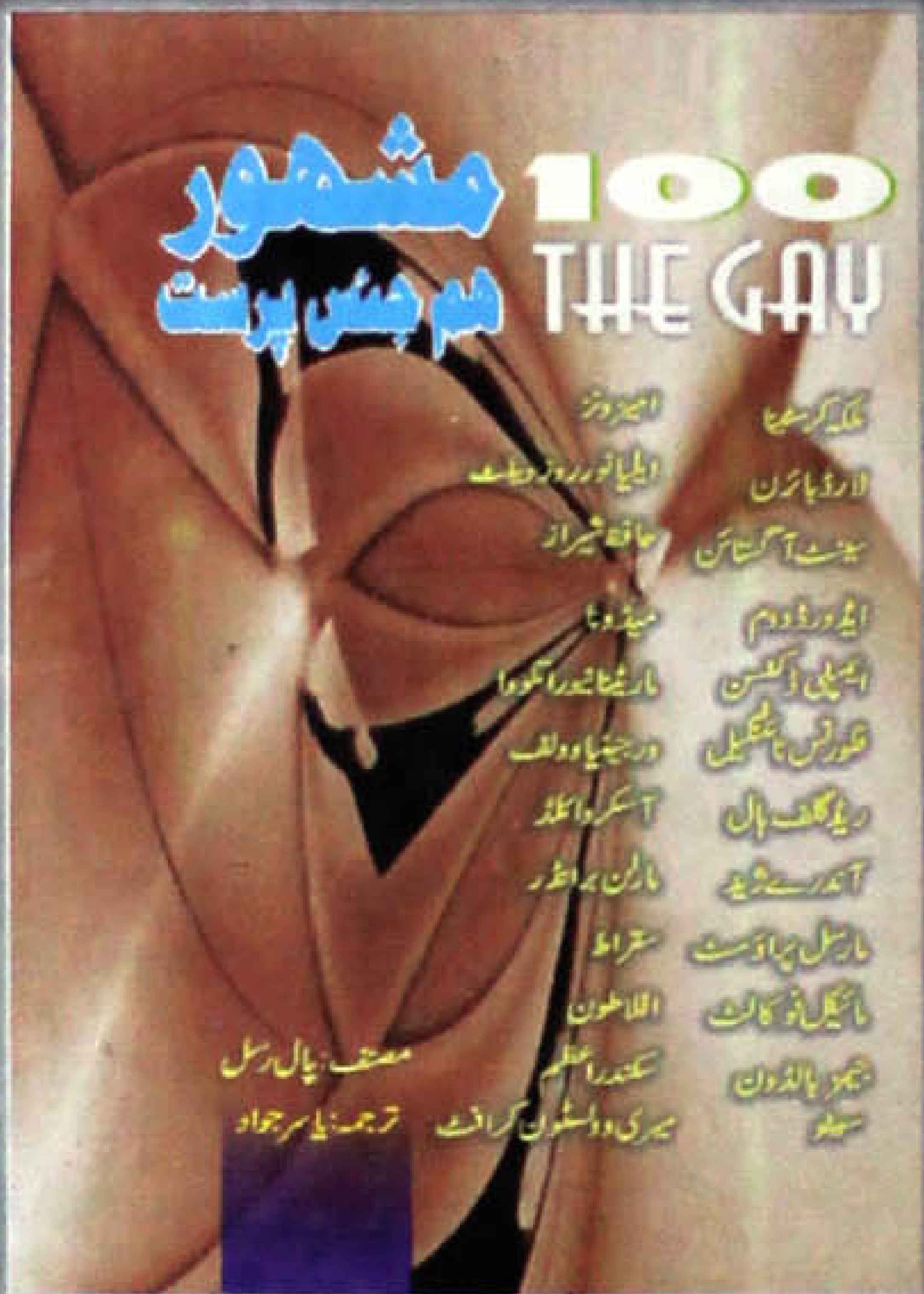
مصنف: ڈیسمنڈ موریس ○ ترجمہ: ارشد رازی ○ قیمت -/150

ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک عورت اور مرد کے جذباتی رشتوں کی تعمیر و تخریب کا قصہ۔ نسائی ہم جنس پرستی کے آغاز کی کتھا اور مرد کے مرد سے لذت اٹھانے کی روش پر روشنی ڈالتی تحقیقی تحریر۔ اردو زبان میں اپنے موضوع پر دستیاب منفرد ترین کاوش۔ جنس کے حوالے سے سینکڑوں اوہام کے اندھیرے کو حقائق کی روشنی سے بدل دینے والی کتاب، ایک شخصیت ساز تحریر، جو سب کیلئے ضروری ہے۔

عورت اور بازار

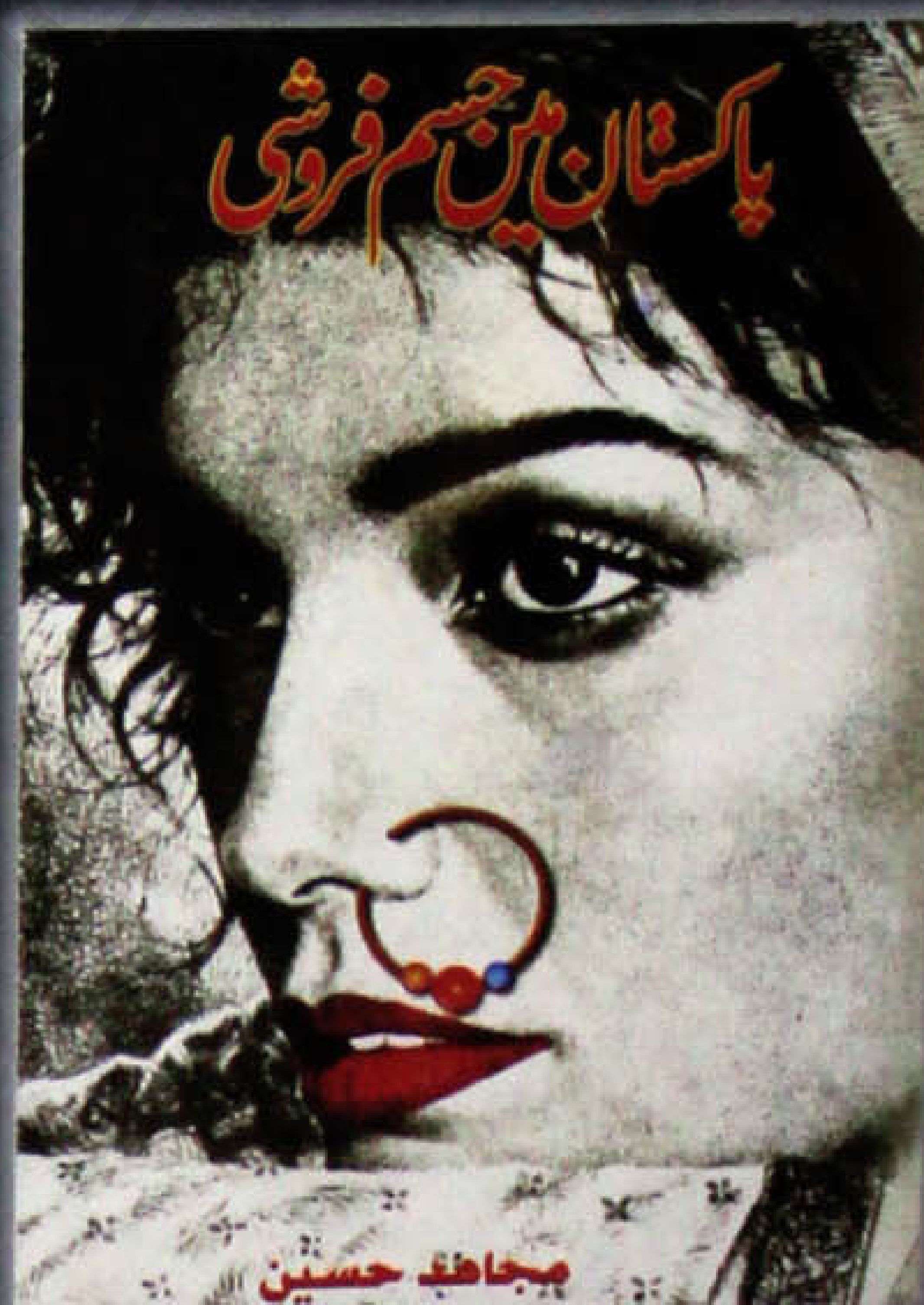
مصنف: منیر احمد ○ قیمت -/160

حوا کی سگی بیٹیوں کی رام کہانی جنہیں ہمارے معاشرے نے سوتیلی بنا دیا۔ دنیا بھر کے بڑے بڑے ''عورت بازاروں'' کی داستان جو انکشاف انگیز بھی ہے اور سنسنی خیز بھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور ضمیر کی پکار کی کشمکش۔ پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی چوتھے درجے کی عورتوں کا احوال۔ گھر کے انتظام سے بازار کے اہتمام تک بنت حوا کے سفر کی چونکا دینے والی روئیداد، اضافہ شدہ ایڈیشن۔









24 مزنگ روڈ، لاہور۔ پاکستان
فون نمبر : 092-42-7322892 - 7354205
E-mail: nigarshat@wol.net.pk

Design By: Agha Nisar 7210011